چہرہ چہرہ رُوبرُو



جمیلہ ہاشمی

چہرہ بچہرہ رُوبرُو

جمیلہ ہاشمی

ناشر

رائٹرز بُک کلب - السیبر سنیٹ جونز پارک لاہور

تعداد —— گیارہ سو

ناشر —— رائٹرز بک کلب، لاہور

قیمت —— پے

طابع —— نقوش پریس، لاہور

سرورق —— صادقین

جس ڈھب سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اِس جاں کی تو کوئی بات نہیں

فیض احمد فیض

بابِ اوّل

وہ سب چلمنوں کے پیچھے جمع تھیں اور انہیں باغ کے سامنے والے حصّے میں ہونے والی محرم کی تمثیل شروع ہونے کا انتظار تھا۔ خیمے گاڑنے والے لڑکے طنابوں کو کستے ہوئے نہایت آہستہ گفتگو کر رہے تھے۔ وہ کبھی کسی رسّی کو کہیں اٹکاتے کبھی کسی خیمے کے سامنے لٹکے پردے کو تھوڑا سا برابر کرتے پھر اندر جھانکتے اور پھر اسے برابر کرتے تھے۔ وہ سب منتظر تھے۔ کیونکہ بھیرہ حاجی ملا صالح کے خانہ باغ کے اندر پہنچنے ہی والی تھی۔ شاہراہِ قراقرم کی دوسری طرف سے آوازیں ایسے طوفان کی سرسراہٹ کی طرح سنائی دے رہی تھیں۔ جو پتوں، شاخوں اور ڈالیوں میں ہو لے ہو لے اپنی گونجیں اپنی صدائیں اور اپنی شدّت کو محسوس کر رہا ہو۔ ام سلمیٰ ٹھوڑی کو ایک ہاتھ پر ٹکائے در سے بالکل سمٹ کر لگی اپنے سامنے لوگوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جوق در جوق لہروں کی طرح آگے بڑھ رہے تھے۔ مؤدب خاموش غمِ حسین رضؓ میں ڈوبے۔ خیموں کے سامنے حسین ابنِ علی رضؓ کے ساتھی جمع تھے۔ یکایک بادل جیسے نیچے جھک آئے۔ درختوں کے سائے نالہ و بکا کی صداؤں سے سیاہ ہو گئے۔ حسین رضؓ سردارِ زناں شاہ شہیداں آلِ رسول صؐ ابنِ فاطمہ رضؓ اپنی بے کسی اور بے بسی میں بھی جاہ و جلال کے ساتھ آسمان کی دوری اور رودِ فرات کی چمک کے سامنے اپنے دشمنوں کے ظلم و استبداد کا مقابلہ کرنے کھڑے تھے۔ زمین ان کے پاؤں تلے لرز رہی تھی کہ وہ اس محترم خون کی امانت کو قیامت تک اٹھانے کا حوصلہ اپنے میں نہیں پاتی تھی۔ فرات کا پانی جس سے یہودی اور عیسائی، خنازیر اور کتّے تک سیراب ہوتے تھے۔ بتول رضؓ کی کھیتی پر بند کر دیا گیا تھا۔ یہ عزّت کی موت اور ذلّت کی زندگی کی جنگ تھی۔ یہ کمزوروں اور طاقتوروں کا مقابلہ تھا۔ یہ حق اور ظلم کی زور آزمائی تھی۔

علی ابنِ حسین ؑ ابنِ علی رضؓ اپنی صفوں سے باہر آئے۔ "میں علی ابنِ حسین ابنِ علی رضؓ ہوں۔ خانہ کعبہ

کے رب کی قسم کہ ہم نبی کے ساتھ اولیٰ ہیں۔ ہم پر کوئی دو غلے کا بچہ حاکم نہیں ہو سکتا۔ پھر لوگوں نے حسین ابن علیؓ پر چاروں طرف سے حملہ کر دیا۔ ان کا سر خون آلود ہو گیا۔ ایک لڑکا ایک خیمے سے ایک لکڑی کا ٹکڑا اٹھا کر گھبرایا ہوا نکلا اور شہید کر دیا گیا۔ ایک کے بعد ایک اہل بیت اور اصحاب سب کے سب شہید ہو گئے۔ حضرت زینبؓ خیمے سے باہر آئیں۔ اے کاش کہ آسمان زمین پر گر پڑتا۔

خدا تعالیٰ تمہاری ذلت و خواری سے مجھے محترم بنائے گا۔ پھر وہ بدلہ لے گا اور ایسا لے گا کہ تمہیں سان و گمان بھی نہ ہو گا۔ بخدا اگر تم نے مجھے قتل کر دیا۔ تو خدا تمہارے آپس میں جنگ و جدال برپا کر دے گا اور تمہارے خون بہائے گا اور اس کے بعد بھی تم سے راضی نہیں ہو گا۔ اور تم کو دگنا دردناک عذاب دے گا۔" ان کی یہ حالت تھی کبھی کھڑے ہوتے کبھی منہ کے بل گر جاتے"۔ پھر جو کچھ ان کے جسم پر تھا۔ شہید کرنے کے بعد لوٹ لیا گیا۔ پھر ان کا مال و اسباب لوٹ لیا گیا۔ جو کچھ عورتوں کے پاس تھا وہ بھی لے لیا۔ فضا میں طوفان کے بند کھل گئے اور تاریک آسمان نہایت بے بسی کے آنسو بہاتا رہا۔

تمثیل کا دوسرا دور شروع ہوا۔

یزید کا دربار تھا۔

زحرابن قیس نے یزید سے کہا۔" خوش ہو جائیے امیر المومنین حسینؓ ہمارے مقابلے میں سے اٹھارہ اور اپنی جماعت میں سے ساٹھ آدمی لائے تھے۔ ہم ان کے پاس گئے اور ان سے سوال کیا۔ وہ امیر کا حکم مانتے ہیں یا جنگ چاہتے ہیں۔ ہم نے آفتاب کے طلوع ہوتے ہی ان پر دھاوا بول دیا۔ ذرا سی دیر میں ہم ان کے آخری آدمی تک پہنچ گئے۔ اب ان کے اجسام برہنہ، ان کے کپڑے خون میں لتھڑے ہوئے، ان کے چہرے خاک میں ملے ہوئے سورج ان کو جھلستا ہوا۔ ہوا ان پر خاک برساتی ہوئی عقاب اور گدھ ان کی زیارت کرتے ہوئے چٹیل میدان میں پڑے ہیں۔

یزید کی بیوی خیمے کا پردہ اٹھا کر چادر اوڑھے باہر آئی۔

اے امیر المومنین کیا یہ حسین ابن علیؓ یعنی ابن فاطمہ بنت رسول اللہ صلعم کا سر ہے

یزید نے کہا،" ہاں اب تم اسے روؤ اور اس ابن بنت رسول صؐ اور خالص النسب قریشی پر سوگ کرو۔ جسے ابن زیاد نے جلد بازی میں قتل کر دیا۔ خدا اسے غارت کرے۔"

پھر امام حسین رضؓ اور ان کے اہل و عیال کا مرثیہ کرتا ہوا ایک شخص نکلا۔ "میں آلِ محمد کے مکانوں کے پاس سے گزرا۔ مگر میں نے ان کو ویسا نہ پایا جیسا کہ وہ ان کی رہائش کے زمانے میں تھے۔ خدا نہ کرے کہ یہ دیار اور اس کے اہلی دور ہوں۔ گو کہ وہ اپنے اہل سے خالی ہو گئے ہیں۔ ابنِ ہاشم کے قتیل نے مسلمانوں کی گردنوں کو ذلیل کیا اور وہ ہو گئیں۔ وہ لوگ سب کی امید تھے۔ مگر پھر مبتلائے آفت ہو گئے۔ وہ آفتیں اور مصیبتیں عظیم و جلیل تھیں۔ کسی غنی کے پاس ہمارے خون کا ایک قطرہ بھی ہو تو یہ اس کو اس کا بدلہ دیں گے۔"

تمثیل کے آخر میں یزید اور اہل بیت کا مکالمہ تھا۔

فاطمہ بنت حسین نے کہا۔ "اے یزید کیا رسول اللہؐ کی بیٹیاں قیدی ہیں"، یزید نے کہا، اے میری بھتیجی۔ میں اس بات کو تو ناگوار سمجھتا تھا مگر تم لوگوں کو عقل نے گھائل کیا۔

زینب نے کہا۔ تم نے جھوٹ کہا ہے تم بدبخت ہو۔"

یزید "خدا کی قسم تم جھوٹی ہو"

زینب۔ خبردار تم ہماری ملّت سے خارج ہو گئے ہو تو اور بات ہے۔

یزید:۔ دین سے تو خارج ہوا تھا تمہارا باپ اور تمہارا بھائی۔

زینب:۔ اللہ کے اور میرے باپ بھائی اور میرے نانا کے دین سے ہی تو تم نے ہدایت پائی۔

یزید:۔ اے خدا کی دشمن تو جھوٹ کہتی ہے۔

زینب:۔ تم امیر ہو ظالمانہ گالیاں دیتے ہو۔ اور اپنی بادشاہت کی وجہ سے قہر کرتے ہو۔

پھر یزید خاموش ہو گیا اور ماتم کرتی ہوئی یزید کی بیوی اور امیر معاویہ کی بیٹیاں خیموں سے باہر آ گئیں۔ علی ابن حسین پابجولاں لائے گئے۔ نالہ و شیون سینہ کوبی کی آوازوں سے زمین بھر گئی چلمنوں کے پیچھے کھڑی اونچے کلاہ پہننے والی بیگمات نے اپنے بال چہروں پر بکھرائے اور سیاہ بختی پر روتی ہوئیں مولا حسین کو پکارنے لگیں۔ علی ابن ابیطالب کا خانوادہ روئے زمین پر سب سے محترم آلِ رسول کا خاندان قیامت تک اسی طرح یاد کیا جائے گا اس یاد میں آسمان اپنے فرشتوں سمیت اور کائنات اپنے آرزوں سمیت ہمیشہ شامل رہیں گے اس راز کو کون سمجھ سکتا ہے، کہ حق کے لئے وہ جانیں ارزاں کی جائیں گی جو حق کو پیاری ہوں وہ چہرے خاک و خون میں لوٹیں گے اور وہ ہونٹ لکڑی سے کھٹکھٹائے جائیں گے جن کو

رسولِ خدا نے محبت سے چوما تھا۔ اے وائے دنیا۔ اے وائے بادشاہت اور جاہ طلبی تو ان آنکھوں کی ایک نگاہ کے عوض بھی گراں ہے۔

شاہراہ قرامِ کی طرف جب یہ گروہ منتشر ہو گیا۔ تو مرضیہ نے بہن سے کہا "خواہرم میری سہیلیاں تم سے بات کرنے کی خواہشمند ہیں کیا تم ہمارے درمیان بیٹھو گی؟

اُمّ سلمیٰ نے محبت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا نہیں آج نہیں۔

مگر میری سہیلیاں تمثیل دیکھنے بہت دور سے آئی ہیں اور وہ زیادہ دیر رک نہیں سکتیں۔ اگر تم ان سے بات کر لو تو وہ خوش ہو جائیں گی۔ کیونکہ تمہاری دانائی کا چرچا تمہیں ان کے لئے نہایت مقدس اور مکرم بنائے ہوئے ہے۔ تمہاری شاعری کی دھوم شاہراہوں سے پرے تک پھیلی ہے۔

اُمّ سلمیٰ نے بہن کی طرف نہایت محبت سے دیکھا "تم باتیں خوب بنا لیتی ہو"

خواہرم یہ شہرت تمہیں میرے نزدیک بھی نہایت محترم بنائے ہے۔ میں فخر محسوس کرتی ہوں کہ تمہاری بہن ہوں۔ گو تمہارے اشعار تو میری سمجھ میں نہیں آتے۔ پتہ نہیں تم کیا لکھتی ہو تم کو نسے خوابوں کی باتیں کرتی ہو کس معشوق کی منتظر ہو؟

تمہاری سمجھ میں میری بعض باتیں بیشک نہیں آ سکتیں مگر سب کچھ جاننا بھی ضروری ہے؟ رویا کی تعبیر کیا ہو کون جان سکتا ہے؟ رویا کیا ہیں؟ یہ بھی کسی کو معلوم نہیں ہو سکتا؟

"بیشک بیشک" مرضیہ نے ذرا بے چینی سے کہا۔ تو پھر میں لڑکیوں سے کہہ دوں کہ تم ہماری طرف آؤ گی؟"

چلو میں تمہارے ساتھ ہی آ رہی ہوں۔ پھر وہ مردانے حصّے سے ملے دالانوں سے ہوتی ہوئیں اندر کی طرف آئیں۔ روئی دار پردے پھٹے ہوئے تھے اور گرم قہوے کی نہایت عمدہ خوشبو چاروں طرف سرگوشیوں، باتوں اور غم پر سے گھومتی ہوئی ان کے گرد اڑتی پھرتی تھی۔ خادمائیں دالانوں سے خوان پوش لئے اپنے گھیر دار لبادوں کے باوجود تیز تیز چلتی کمروں میں آ جا رہی تھیں۔ جہاں مہمان جمع تھے اور اب اپنا فاقہ توڑنے کے لئے شربت اور روٹی کے منتظر تھے۔ پھر وہ گرم قہوے سے زمستان کی اس شام کی ٹھٹھری ہوئی اداسی دور کریں گے غم و حزن سے مرجھائے ہوئے دل اور آنسو بہا کر تھکی ہوئی سرخ آنکھیں آرام پائیں گی۔ سمادار کے قریب بیٹھ کر تپش سے وجود سکون پائے گا۔ وجود سکون پاتا

ہے رُوح غم انگیز واقعات کو بھلا دیا کرتی ہے ۔ دل کاروبارِ حیات میں پھر خوشی تلاش کر لیتا ہے ۔ کیونکہ وقت بڑے سے بڑا زخم مندمل کر دیتا ہے ۔ ہاں زخم بھر جاتے ہیں ۔ مگر چٹان ٹوٹ جائے تو پہاڑ کا وہ حصّہ اسی طرح بدنما لگتا رہتا ہے ۔ اسے صدیاں اور قرنیں بھی درست نہیں کر پاتیں ۔ لڑکیوں نے نہایت پُرشوق نگاہوں سے امّ سلمیٰ کو دیکھا ۔ وہ دبی دبی ہنسی اور واضح حیرت کو چھپا بھی نہیں سکی تھیں ۔ اپنے لبادوں کو سمیٹتی ہوئیں وہ سیاہ کلاہ اپنے سر پر جما کر مسکرانے کی کوشش میں تھیں ۔

مرضیہ نے کہا " خواہرم یہ تم سے وہ ساقی نامہ سننے کی خواہشمند ہیں ۔ جس کا چرچا قہوہ خانوں میں بھی ہو رہا ہے ۔

امّ سلمیٰ نے مسکرا کر کہا " ہمارے عم زاد کی مہربانی ہے کہ وہ اسے داد حاصل کرنے کے لئے جگہ جگہ لئے پھرتا ہے ۔ " اس کی مسکراہٹ نہایت دلکش تھی ۔ جیسے شام پڑے اندھیرے کمرے میں چراغ جل اٹھے ۔ دانتوں کی چمک اور اندرونی مسرّت ایک شان بے نیازی اس کے چہرے کو تابناک بنا رہی تھی ۔ ایک ایسی کیفیت جسے سرشاری اور غم کے درمیان کوئی سا نام نہیں دیا جا سکتا ۔

" ام سلمیٰ کیا ہم سب بیٹھ جائیں " مرضیہ نے پوچھا ۔

نہیں ۔ آج نہیں ۔ شاہ شہیداں پر ابھی چار گھڑیاں بھی نہیں گزریں ۔ میں تم لوگوں کو پھر کبھی بہت سے اشعار سناؤں گی ۔ تم سب بُرا نہیں منانا ۔ ہر کام کے لئے ایک وقت ہوتا ہے " وہ چپ ہو گئی ۔

لڑکیاں ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگیں ۔ مرضیہ مایوس ہو کر باہر دیکھنے لگی ، جہاں اونچے دریچوں کے رنگین شیشوں میں سے بادلوں کے گھیرے کو توڑ کر آتی ہوئی سورج کی آخری کرنوں نے قوس قزح کے سارے رنگ ایک دم چہروں پر بکھیر دیئے تھے رودِ نور میں ابھرتی ڈوبتی جھجکتی شرماتی لڑکیوں کے نہایت ملیح چہرے آنکھوں میں پڑتے عکس اور جھپکتی پلکوں کی وجہ سے کسی اور ہی دنیا کے معلوم ہو رہے تھے ۔ رویا میں دیکھے وجود کی طرح نہ ہی سب کے سب ظاہر اور نہ ہی چھپے ہوئے ، " مگر رویا کا کیا اعتبار " امّ سلمیٰ نے دل میں سوچا اور یہ لڑکیاں اس کے دل میں لگی آگ اور اس نار میں جلتے اس کے وجود اس کے ذوق و شوق اس کی بے چینی کو کیسے سمجھ سکتی ہیں ۔ قہوہ خانوں میں یونہی چرچا ہو رہا ہے

لوگ جب ایک شے کو سراہنے لگتے ہیں۔ تو بنا سمجھ اس پر سر دھنتے چلے جاتے ہیں۔ بھلا انہیں کیا خبر ہے کہ میں کس کی منتظر ہوں۔ انہیں کیا معلوم کس ساقی کا مجھے انتظار ہے۔ اس التہاب جینم کی ایک جھلک بھی تو انہیں دکھائی نہیں دے سکتی۔ ہاں فرزانوں کی بیٹیاں یہ کیسے سمجھ سکتی ہیں؟ اس نے دل ہی دل میں دہرایا۔ تمہیں خدا کی قسم مجھے الزام نہ دو۔

ہاں میرے گھر میں رہنے والی میری بہنو مجھے الزام نہ دو۔
جب میں محبوب کا دروازہ کھٹکھٹاؤں تو مجھے کچھ نہ کہنا۔
کیونکہ میرے لئے یہی حکم ہے کہ میں اس تک چل کر جاؤں۔
قدموں سے چل کر نہیں سر کے بل۔
سر جب آنکھیں راہ کی دھول میں مل جائیں۔
روشنیاں ماند پڑ جائیں ستاروں کا نور بجھ جائے۔
ہاں یہ میرا وجود اپنی ساری آلائشوں سے یوں پاک ہوگا۔ جیسے نیا پیدا ہوا بچہ پاک ہوتا ہے
آنکھیں جب محبوب کو دیکھنا چاہیں تو پھر کسی اور کو دیکھنے کی تمنا نہیں کرتیں۔
کوئی اور چہرہ اس چہرے سے زیادہ قابلِ تمنا نہیں۔
کاش وہ چہرہ میری آنکھوں کے مقابل ہو۔
ہاں میرے محبوب تیری خواہش مجھے جانے کہاں کہاں لئے پھرے گی۔
تمہیں خدا کی قسم ہے مجھے الزام نہ دو۔

ان شعروں کی نغمگی نے جیسے اسے جکڑ لیا۔ بے اختیار اس کیفیت نے اس پر ایک عجیب از خود رفتگی طاری کر دی۔

"ام سلمیٰ!" مرضیہ نے کہا کاش تم نے اپنا فیصلہ قطعی اور آخری نہ کیا ہوتا۔

"غم کی ہنسی اڑانا مجھے اچھا نہیں لگتا" ام سلمیٰ نے نہایت نرمی سے کہا۔

بخدا ہم لوگ تو صرف تم سے تمہاری زبان سے وہی اشعار سننے کے آرزومند تھے اور کچھ نہیں، غم کی ہنسی کون اڑا سکتا ہے اور پھر حسین ابن علی کے غم کی۔ جو سب کا غم ہے۔ کیا تم مجھے اپنے سے بہت ہی کم تر سمجھتی ہو؟" مرضیہ کی آواز آنسوؤں میں ڈوبتی ہوئی لگی۔

ام سلمیٰ نے آگے بڑھ کر اس کا سر اپنے کندھے سے لگا لیا۔ لڑکیاں ہنسنے لگیں۔ اور وہ سب دیوار کے ساتھ بڑے بڑے تکیوں کے سہارے بیٹھ گئیں۔ کیونکہ انہوں نے ابھی فاقہ

نہیں توڑا تھا اور شربت کے فنجان لئے بوڑھی مرجانہ ان کی طرف آرہی تھی۔ ام سلمٰی کے پاس آکر اس نے کہا "جانم تمہارے لئے اسکندر کتابیں اور خطوط لایا ہے۔ اور وہ اندرونی ڈیوڑھی میں منتظر ہے"، فنجان بڑھا کر اس نے کہا میں اسے کہہ آئی ہوں کہ وہ پچھلی سیڑھیوں کے قریب ٹھہرا ہے تاکہ تم ناقے کی مشقت سے فارغ ہو جاؤ۔

ام سلمٰی نے فنجان لے کر پاس پڑے ہوئے میز پر رکھ دیا۔ اس کے ہاتھ اندرونی اضطراب سے ذرا ذرا کانپ رہے تھے۔

مرجانہ نے کہا "سید کاظم رشتی اب بہت بوڑھے ہو چکے ہوں گے۔ جب میں بالکل ذرا سی بچی تھی تو اس خانقاہ کے قریب درختوں کے جھنڈ میں کھیلا کرتی تھی۔ وہ اپنے درس سے فارغ ہو کر اکثر باہر نکلتے تو میرے سر پر ہاتھ پھیرتے۔ وہ بہت ہی شفیق اور باپ کی طرح مجھ پر مہربان تھے اب اگر مجھے دیکھیں تو پہچان ہی نہ سکیں"

"تم نے پہلے تو کبھی نہیں ہمیں بتایا کہ تم سید کاظم رشتی کو جانتی ہو۔ تم نے انہیں دیکھا ہے" ام سلمٰی نے سیدھے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"جانم میں اتنے بہت سے لوگوں کو جانتی ہوں نجف اشرف میں رہی ہوں۔ تمہیں کس کس کا بتاؤں گی یہ تو اسکندر کہہ رہا تھا کہ میں وہاں سے ہو کر آیا ہوں"، مرجانہ نے اپنے لمبے دوپٹے کو کندھے پر درست کیا تاکہ فنجان اٹھانے میں وہ پھر ہاتھوں پر نہ ڈھلک آئے۔

"اور تم نے شیخ احمد احسائی کو بھی تو دیکھا ہو گا" ام سلمٰی نے پوچھا۔ مرجانہ نے ایک بڑے خوان میں شربت کے فنجان رکھ دیئے اور لڑکیوں نے فاقہ توڑنے کے لئے روٹی کے ٹکڑے اٹھائے

"خواہرم تم شربت چکھ لو"، مرضیہ نے فنجان اٹھا کر ام سلمٰی کو دیا۔

"مرجانہ تم مجھے شیخ احمد احسائی کے متعلق بھی تو بتاؤ"، "میں یاد کرنے کی کوشش کروں بھی تو یاد نہیں آئے گا۔ کیونکہ شیخ احمد احسائی کی مہلتِ زندگی مجھ سے پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔ خانقاہ کا لق و دق صحن درختوں کے سائے اور حجروں میں معتکف درویشوں کی عبادات، قرآن پڑھتے ہوئے طالب علموں کی یکساں آوازیں محرابوں اور دروازوں، ستونوں اور چار دیواری کے اندر پانی گرنے اور تالاب بھرنے کی صدائیں بس یہی کبھی کبھار یاد آتا ہے۔ پھر اس نے گھٹنوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر اٹھتے ہوئے کہا۔ "اب اس سفید بالوں سے ڈھکے سر میں سوائے سید کاظم رشتی کی تشبیہ کے اور کوئی صورت واضح نہیں ہے اور وہ بھی اس لئے کہ مجھے اپنے سر پر ان کے ہاتھ کا دباؤ اب بھی کبھی کبھا

محسوس ہوتا ہے۔

" تم خوش بخت ہو مرجانہ نہایت ہی خوش نصیب" ام سلمیٰ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ مرضیہ اب میں آپ لوگوں سے اجازت چاہوں گی۔ ساقی نامہ پڑھنے کا وقت یہ شام نہیں، بہرحال میرا وعدہ رہا آپ لوگ پھر اکٹھا ہوں۔ خوشی کا دن ہو۔ تو میں اور بھی بہت کچھ سناؤں گی آپ لوگ مجھے معاف کر دیجئے۔ میری معذرت قبول کر لیجئے" اور اس سے پہلے کہ کوئی اسے جواب دیتا وہ مرجانہ کے پیچھے ہی کمرے سے نکل گئی۔

اسکندر نے سیڑھیوں پر بیٹھے بیٹھے سرخ ہوتے سورج کو دیکھا عجیب طرح کی سرخی ہے۔ خون رنگ شاہ شہیداں کا ہے۔ یہ خون اور اسے یاد آیا کہ وہ نجف اشرف سے آیا ہے اور اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا اور اس نے ابھی تک فاقہ نہیں توڑا۔ اب آقائے صالح کی بڑی صاحبزادی پتہ نہیں کب آئیں وہ بغچے کو بغل میں دبائے دبائے اندر مطبخ کی طرف چلا گیا جہاں خوب چہل پہل اور رونق تھی۔ چار لوگ اکٹھا ہوں تو خواہی نخواہی جشن کا گمان ہونے لگتا ہے عجیب بات ہے۔ اس نے جی میں سوچا۔ اور پھر وہ داروغہ مطبخ کی طرف بڑھ گیا۔"

" ام سلمیٰ نے اپنی جوان خادمہ ملکی سے کہا کہ وہ اسکندر کو تلاش کرے۔ ان سیڑھیوں پر اکیلے کھڑے ہو کر اس نے بھی سوچا۔ سرخی میں خون گھلا ہوا لگتا ہے کتنی صدیاں گزر گئی ہیں اور ابھی تک زمین و آسمان مل کر ماتم کرتے ہیں۔ مولا حسین کے سوگ میں شام کتنی سیاہ پوش ہے۔ فضا سوگوار ہے۔ پرندے درختوں میں کتنے چپ بیٹھے ہیں جیسے مر گئے ہوں۔ ایک دم اسے اپنے گرد تنہائی اور سناٹے کا شدید گمان ہوا اور یاد آیا کہ امام غائب پر بھی ہزار سال گزر چکے ہیں۔ دنیا کو اس سناٹے پر ایک گرج کا انتظار ہے۔ سیاہی کے کاٹ کے لئے نور کے ایک ظہور خنجر کا۔ ظہور آلِ محمد کا وقت ہے۔ پتہ نہیں اس کے خوابوں کی کیا تعبیر سید کاظم رشتی نے لکھی ہوگی۔ قزوین اور نجف کا فاصلہ بہت ہے اور وہ نہایت مضطرب ہو گئی کہ اسکندر نے اس کا انتظار کیوں نہیں کیا۔ وہ کیوں اِدھر اُدھر ہو گیا ہے۔ یہ خادم لوگ احساس ذمہ داری سے قطعاً ناآشنا ہوتے ہیں۔ پھر اس کے پیٹ کی گہرائیوں میں ایک غبار سا اٹھا اس نے بھی تو سوائے شربت کے ایک جرعے کے اور کچھ نہیں کھایا تھا اور یہ کہ اسے آنے والے دنوں میں اپنے صحن کی رونق کی خاطر اپنا دھیان بھی تو رکھنا چاہیئے وہ انہی

سیڑھیوں پر تقریباً دوہری ہو گئی۔ درد کی لہریں بڑھتے ہوئے طوفان کی بے پناہ شدت سے اس کی طرف آ رہی تھیں۔ اس کو ڈھانپ رہی تھیں اس کے اوپر بہے جاتی تھیں۔ تنکے کی طرح وہ اسے اپنے ساتھ کھینچ رہی تھیں وہ بے سہارا سی ان کے ساتھ ہچکولے کھا رہی تھی۔ جھاگ اڑاتی ہوئی رودِ سیل جو نہ جانے کہاں رکنے والی تھی۔ اس کی بند آنکھوں کے سامنے عجیب تماشے ہو رہے تھے۔ سیاہ دھبے آنکھ مچولی کھیلتے پھرتے تھے اور لاتعداد ذرات نور سے الجھے ہوئے تھے۔ سرخی میں سمندر الٹ پلٹ ہو رہے تھے اور پھر بھی کناروں سے باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ بین کرنے کی صداؤں کے ساتھ پتے درختوں سے نیچے گر رہے تھے۔ جیسے قیامت آ گئی ہو۔ ہر شے ایک سیاہ ہوا کے ساتھ اپنے خول سے باہر نکلی پڑتی تھی اور ریزہ ریزہ ہو رہی تھی۔ زمین اپنے محور پر الٹی گھوم رہی تھی اور کائنات اپنے ستاروں اور سیاروں، سورجوں اور روشنیوں سمیت دائرے میں تیز حرکت کر رہی تھی۔ جو ہر چکر کے ساتھ تاریکی میں گم ہو جاتی تھی۔ سارے رنگ گھل کر ایک گرجتے ہوئے دھارے کی صورت میں اس کی طرف امنڈ سے آتے تھے اور پھر اس کو چھوئے بنا آس پاس بہہ جاتے تھے۔ ننا۔ ننا ہر شے ننا ہوئی جاتی تھی۔ ایسے میں بھلا اس کی کیا حقیقت تھی؟ اس کے خیالوں کی اور اس کے تصور میں بسی صورتوں کی۔ یہ نہ ہی جنت تھی اور نہ ہی جہنم تھا۔ ایک بنا آواز کے تباہی تھی۔ جو بے پیندے کے بنا اتھاہ کے کسی خلا میں گر رہی تھی۔ بھلا اس میں کیا طاقت تھی کہ وہ اسے روک سکے۔ سوچ کی حرکت کی ساری قوتیں بیکار تھیں۔ بالآخر آرزؤں اور تمناؤں والی، دل گھبرانے والی آنسوؤں اور قہقہوں سے عبارت زندگی کا یہ انجام ہوا تھا۔ بھلا تنکے اور ذرے بھی سوچ سکتے ہیں؟ کیا وہ اس خواب سے جاگے گی یا بس وہ ختم ہو چکی ہے۔ یا پھر خود زندگی کا تخلیقِ نو کا ایک جان لیوا درد تھا جس سے بالآخر نجات ملے گی۔

نانی نے اسے سیڑھیوں پر دوہرا جھکے ہوئے تقریباً نیم بیہوش پایا۔ ملا محمد نے کہا "عروس بالآخر ہمارا باغ شاداب ہوا ہے" تو اسے خوشی ہونے کی جگہ رونا آیا۔ وہ اُمِ سلمیٰ جو دنیا میں آنے والے زمانے کے کسی طاقت کے سرچشمے کا انتظار کر رہی تھی اور جانے کس کس فلسفے کے معانی سمجھنے کے لئے کاظم رشتی سے خط و کتابت کرتی تھی۔ وہ ملا محمد کے باغ کی شادابی کا باعث ہوئی تھی۔ وہ عم زاد جس کا دل ہی دل میں وہ مذاق اڑایا کرتی تھی آخر ایک فاتح کی طرح پر غرور اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اسے اپنے عورت ہونے پر سخت غصہ آیا۔ اس کا جی چاہا وہ اپنے پہلو میں لیٹے گوشت کے اس ذرا سے لوتھڑے کو اٹھا کر ملا محمد کے منہ پر دے مارے یا اس کے پرزے بکھیر کر ایک طمانیت کا قہقہہ لگائے مگر نہیں۔ اس نے سر اپنے سینے پر جھکا لیا اور نانی کو آواز دی ملا محمد گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ شاید اس نے پھر نادانستہ اپنی ہم زاد کی عروس لالہ کو برہم کر دیا تھا۔ وہ اسے دیکھتا رہا۔ نانی اس بڑے پلنگ کی پائینتی کھڑی تھی۔ جہاں سرگوشیوں میں کبھی گونج پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ام سلمیٰ

کو پکڑنا سائے کو پکڑنا تھا۔ سایہ جس کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ ایک لمحے کو بھی اس نے یگانگت محسوس نہیں کی۔ جو دو مختلف وجود یکجائی سے محسوس کرتے ہیں۔ وہ ان خلوتوں میں کبھی نہیں ہوئی۔ وہ قسم اٹھانے کو تیار تھا کہ اس ام سلمی کی خواہش اسے ہمیشہ رہی۔ جو اس کی عم زاد ملا صالح کی صاحبزادی اور شاعرہ تھی۔ اس کی عروس تو مٹی کا مجسمہ تھی۔ جس نے نہ کبھی ہنسی میں اپنے آپ کو سمجھایا ہے اور نہ ہی کبھی خفگی میں۔ اور وہ اس سے کبھی خفا بھی کہاں ہوتی تھی۔ عجیب لاتعلقی تھی۔ جس میں بیگانہ پن بھی نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا اختلاف ہو وہ اس پر چیخے دوسرے مردوں کی طرح یہ جمی جمائی زندگی تہس نہس ہو۔ کوئی زلزلہ آئے مگر نہیں اس نے سر جھکا لینا ہی کافی سمجھا تھا۔ یوں وہ گفتگو میں اس قدر عاجز تو نہ تھی۔ باپ سے برابر بحثیں کیا کرتی تھی۔ شادی سے پہلے سب لوگ سمجھتے تھے کہ اس نہایت ذہین اور بیحد خوب صورت لڑکی کے ساتھ ملا محمد کی زندگی ایک مثالی زندگی ہوگی۔ وہ خود بھی کسی سے کم نہیں تھا۔ خاندان کی لڑکیاں اس کی وجاہت سے بہت متاثر تھیں شاہراہوں سے جہاں وہ گزرتا تھا اسے احساس رہتا تھا کہ چلمنوں کے پیچھے اس کی سیدھی چال اور اونچی پیشانی کو مائیں بھی سراہتی ہیں اور ایسے داماد کی تمنا کیا کرتی تھیں۔ نجف اشرف میں جہاں وہ پڑھتا تھا نہایت قابل سمجھا جاتا تھا۔ استاد اس سے خوش ہوتے تھے اور علمی مباحث میں کئی بار نہایت ادق مسائل صرف اسی نے حل کئے تھے۔ فلسفہ اس کا پسندیدہ مضمون تھا اور جب اس نے ام سلمی کو بھی اسی مزاج کا پایا۔ تو اسے بیحد خوشی ہوئی۔ بچپن سے ہی وہ اس سے منسوب تھی اور ملاقات تقریباً کبھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنی بہنوں سے اس کی باتیں سنتا تھا اور دل ہی دل سفرِ حیات کے منصوبے بناتا تھا۔ مگر سارے منصوبے دھرے رہ گئے۔ ان کے درمیان کبھی کوئی گفتگو نہیں ہوئی اپنے اشعار اس نے کبھی اسے دکھنے کے لئے بھی نہیں دیئے۔ فلسفے اور علم کی باتیں تو دور کی بات ہے۔ ان کے درمیان فاصلہ بڑھتا گیا۔ اب وہ اکثر اپنے والد کے ہاں رہتی تھی۔ یہ ننھا وجود جس میں ان دونوں کی شباہت تھی۔ شاید اس خلیج کو پاٹ سکے۔ جو ان کے درمیان روز بروز وسیع ہوتی جاتی تھی۔ پچھلے دنوں کی طرح اس نے اپنے والد کے گھر میں بھی اس سے کوئی بات نہیں کی اور ہانی کو پکار لیا تھا۔

پھر دوسرے دروازے سے مرضیہ آئی اور اس کو آداب کیا۔

آقائے محمد آپ کو کونسے نام پسند ہیں؟

"مجھے ایسے نام اچھے لگتے ہیں جو بہت عام نہ ہوں"، جیسے تمہارا نام ہے مختصر اور پر معنی۔ میں نے تو سوچا آپ کو سب سے زیادہ میری بہن کا نام پسند ہوگا۔" اس نے شوخی سے کہا تمھاری بہن کا نام پسند نہ کرنے کی گستاخی میں کیونکر کر سکتا ہوں اور اسی لئے مجھے اپنی عم زاد مرضیہ کا نام اچھا لگتا ہے"، ملا محمد ہنسا تو اس کے سفید دانتوں کی لڑیاں دکھائی دیں۔ مرضیہ نے جی میں کہا۔ "ہمارے عم زاد وجیہہ ہی نہیں خوش گفتار ہے

ام سلمیٰ پتہ نہیں کیوں اس کی طرف ملتفت نہیں ہوتی ؟

جانے کا وقت آیا تو ملا محمد نے جھک کر بچے کو پیار کیا۔ پھر بیوی کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ گھر تمہارا منتظر ہے عروس اس نے زیر لب کہا۔

ام سلمیٰ ایسے بیٹھی رہی جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ اس کے چہرے پر کوئی رنگ نہیں پھیلا۔ اس نے سر اٹھا کر شوہر کی طرف دیکھا تک نہیں۔

جب مرضیہ بھی جا چکی اور شام کے کاروبار سے فرصت ہو گئی۔ ہانی نے کہا۔

"وہ کیا میں وہ خطوط اور کتابیں لاؤں جو اسکندر نے لا کر دی ہیں"۔

ام سلمیٰ نے آہ بھر کر کہا۔ کتنے دن ہو چکے ہیں ایک ماہ سے زائد ہو گیا ہے اور مجھے کتنی عجلت تھی پتہ نہیں میری عجلت خدا کو پسند نہیں آئی۔ اور پھر نہایت اچانک اس نے ہانی کو قریب بلا کر کہا "تم نے کبھی خدا کو دیکھا ہے۔"

ہانی نے اپنی پوری آنکھیں کھول کر حیرت سے اپنی آقازادی کی طرف دیکھا۔

"میں پوچھ رہی ہوں تو نے کبھی خدا کو دیکھا ہے۔"

"آقازادی آپ کا مذاق میری سمجھ میں نہیں آیا اور خدا سے متعلق" اس نے کانوں کی لوؤں کو چھو کر کہا۔

ہانی میں مذاق نہیں کر رہی۔ مگر یہ تم کیوں سوچتی ہو کہ تم خدا کو دیکھ نہیں سکتیں۔ خدا جو ہر شے میں جاری و ساری ہے۔ خدا جو ہر شے کے اندر موجود ہے۔ خود سب جگہ ہے۔"

ہانی نے کہا "آقازادی اگر خدا ہر شے کے اندر موجود ہے تو میرے اندر بھی موجود ہوگا" اس نے خوشی سے یا اضطراب سے پلنگ کی پائینتی کو اتنا مضبوط پکڑا کہ اس کی انگلیوں کے جوڑ سفید لگ رہے تھے۔ وہ بیہوش ہونے کے قریب تھی۔

"تم نے اس سے پہلے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ خدا تمھارے اندر موجود ہے تم خدا کا ایک حصّہ ہو"

"نہیں بخدا آقازادی نہیں" اس نے دیوانوں کی طرح کہا۔ "میں یہ سوچنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتی میں اتنا بڑا بوجھ کیسے اٹھا سکتی ہوں۔ میں تو صرف ہانی ہوں۔ میرے اندر بھلا خدا کیسے اتر سکتا ہے؟"

وہ دھپ سے زمین پر بیٹھ گئی اور اس نے اپنا سر اپنے ہاتھوں سے مضبوط پکڑ لیا۔

"ہاں آدمی خدا کا ایک حصہ ہے" ام سلمیٰ نے نہایت آہستگی سے کہا۔ "ہانی تمہیں کیا ہو گیا ہے اس نے اسے آواز دی۔ مگر ہانی بیہوش ہو چکی تھی۔

مرجانہ، دردانہ، ناجیہ" اس نے زور سے پکارا کوئی ہے۔"

پھر خادماؤں کا ایک گروہ اندر داخل ہوا۔" کیا بات ہے جانم" مرجانہ نے کہا۔ ہانی کی طرف اشارہ کرکے ام سلمیٰ نے کہا اسے جگاؤ۔

وہ سب کی سب اس کی طرف پلٹیں انہوں نے اسے جگانا چاہا مگر ہانی کہاں تھی؟ اس کے نازک وجود کو انہوں نے ایک پھول کی طرح اٹھالیا اور باہر لے آئیں۔ کہیں اسے سکتہ تو نہیں ہوگیا۔

پھر طبیبوں کے لئے بھاگ دوڑ شروع ہوئی اور اس شام نے ہانی کو سرد مٹی کی تہوں تلے دیکھا۔ جہاں زمستان کی ہواؤں سے درخت ننگے ہوچکے تھے اور بادلوں کے گھیرے میں سورج بھی اڑتا ہوا لگتا تھا۔ ہر شے بے رنگ اور اداس تھی۔

ام سلمیٰ پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ "اس نے اپنے نظریے کی آزمائش ہانی سے کیوں شروع کی؟ اور فلسفے کی ان موشگافیوں کے لئے اس جاہل لڑکی کا انتخاب کیوں کیا۔ اس پر اب ایک بار پھر یہ عیاں ہو گیا تھا کہ یہ مسئلہ عام لوگ کبھی بھی نہیں سمجھ سکیں گے۔ بھلا ایک نہایت سادہ لوح انسان کے لئے اس بات کی اہمیت کیا ہے کہ خدا اس کے اندر ہے یا نہیں؟ عام لوگ جو خدا کی پیدا کردہ اس دنیا میں آئے تھے اور اس کے متعلق سوچے بنا چلے جاتے تھے وہ کیا جان سکتے تھے کہ ان کی زندگیوں میں ان کے اندر اور باہر اپنے سارے نور و ظہور، اپنے سارے جلال و جمال کے ساتھ اپنی ساری طاقتوں اور عظمتوں کے ساتھ وہ موجود ہے خود ان کے اندر وہ اپنے پرتو کو ان سارے آئینوں میں بار بار نظارہ کرتا ہے۔ وہ پھول میں بھی ہے اور پروانے میں بھی۔ وہ ہر شے آپ ہے۔" ام سلمیٰ پر کپکپی طاری ہوگئی۔ کیا ہی اچھا ہوتا وہ جاہل ہوتی۔ کتابوں کی باتیں تو آدمی کو الجھا دیتی ہیں۔ اس سے جینے کا سارا مزہ چھین لیتی ہیں۔ وہ سوچتا ہے اور کئی رازوں کو جاننے لگتا ہے اور بھاری پتھر کی طرح یہ رازوں کو جان لینا اس کے لئے بوجھ بن جاتا ہے۔ جسے اٹھائے اٹھائے وہ موت تک چلا جاتا ہے اور اسے موت کیوں آتی ہے۔ موت کیا ہے؟۔

کیا خدا ایک آئینے میں اپنا نظارہ کرکے تھک جاتا ہے اور آئینے کو توڑنا اس پر لازم آتا ہے میثاقِ ازل کیا ہے؟

ہانی نے سید کاظم رشتی کے خطوط اور کتابیں کہاں رکھ دی تھیں؟ اس نے دوسرے دن اور تیسرے دن بھی کمرے میں ادھر ادھر اپنی تلاش جاری رکھی۔ تعجب ہے کہ میں اتنے عرصے سے یہ راز جانتی تھی۔ کب سے پڑھتی چلی آئی تھی۔ خدا اور آدمی کا رشتہ اور الہیات اور بہت سی باتیں مگر مجھے کبھی کچھ نہیں ہوا۔ مجھ پر کبھی بیہوشی طاری نہیں ہوئی۔ میرا دل کبھی زور سے دھڑکا تک نہیں۔ اور ہانی نے محض یہ سن کر کہ اس کے اندر خدا ہے، جان دے دی۔ وہ سوچتی تھی اور اس کے خیالوں میں الجھاوے پیدا ہو رہے تھے۔ وہ کس سے پوچھے کیا کوئی

اس کے سوالوں کے جواب دے سکتا ہے؟ اسی الجھن کو دور کرنے کے لئے اس نے نجف اشرف میں کاظم رشتی کو لکھا تھا مگر اتفاقات ہیں کہ وہ ان جوابات کو پڑھ بھی نہ سکی۔ اور اب تانی نہیں تھی اسے اپنے آپ پر سخت غصہ آتا۔

اپنے باپ اور اپنے سسر کو وہ سب کیا کہتی؟ وہ دنیادار اور معمولی آدمی تھے اور پھر سیاست کی بساط پر بھی ان کا کھیل جاری رہتا تھا۔ ایران تیز طوفانوں کی زد پر تھا اور بادشاہ اپنی روز بروز کم ہوتی طاقت کو مجتہدوں کے زور سے مضبوط پکڑے ہوئے تھا۔ زندگی جب معمول پر ہو تو خانقاہوں میں علم و عقل اور مباحث و تصنیف کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ایسے میں جب صرف تقلید اور اندھا دھند اطاعت ہی سب سے بڑا مسئلہ ہو کسی اور تعلیم کی گنجائش ہی کہاں تھی؟ شاہِ وقت بیرونی طاقتوں کی روک تھام میں اپنی ساری طاقت صرف کر رہا تھا۔ مگر اس کو روز ذلیل ترین معاہدوں میں اپنا آپ گرفتار کرنا پڑتا تھا۔ وہ گھر میں بیٹھنے والی کم ہمت اور بڑے باپ کی بیٹی ہونے کی وجہ سے اور بندھنوں میں جکڑی تھی۔ عام آدمی جن باتوں کو آپس میں بیٹھ کر سلجھا لیتے ہیں۔ سارے بوجھ جو وہ ایک دوسرے کے سامنے اتار سکتے ہیں۔ اس کے دل پر اسی طرح تھے۔ وہ کسی سے یہ بات بھی نہیں کر سکتی تھی تانی سے بھی نہیں۔

اس نے نہایت جانفشانی سے سید کاظم رشتی کے خطوط اور کتابوں کی تلاش شروع کر دی۔ وہ نجف اشرف میں شیخ احمد احسائی کے درس میں شریک ہونے کے لئے بہت دور سے آئے تھے اور اپنی صومعہ نشینی کے باوصف فرقہ شیخیہ کے مقلدوں میں اپنا خاص مقام رکھتے تھے جس فرقے میں اس کا اپنا باپ بھی شریک تھا

بابِ دوئم

عربوں کو دوسری قوموں پر فضیلت اپنی عزت اور قوت مدافعت کی وجہ سے ہے وہ اپنے چہروں کی خوبصورتی اپنی سخاوت اپنی شجاعت گفتار کی حکمت پختگی عقل عزتِ نفس اور وفا کی وجہ سے ممتاز ہیں اور ان عربوں سے حضرت علی رضؓ باب علم تھے جو رسولِ خدا تک جاتا تھا جو وہ شہر علم تھے وہ جو تھے خلیفہ ہونے کی وجہ سے نہیں یونہی حلیم الطبع، شجاع، ایثار نفسی میں یکتا اور نفس کشی میں بے ہمتا تھے۔ صداقت کی محبت سے منور، کتاب اللہ سے آگاہ۔ وہ لاثانی مسلمان تھے جو عین شباب عالم میں داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ کمزور اور ضعیف کے ملجا و ماویٰ ساری زندگی انہوں نے اسلام اور اسلامیوں کی خدمت میں وقف کردی۔ وہ اپنی انہی خوبیوں کی وجہ سے مجبور تھے کہ جنگ میں دشمنوں کو نیزوں پر اٹھانے، قرآن پاک کی حرمت کی خاطر امان بخشیں اور پھر انہی دشمنوں نے خلافت بزورِ شمشیر آلِ علی سے چھین لی۔ یزید کے محل کی دیواروں تلے رسول خدا کی نواسیاں ماتم کناں بیٹھی تھیں اور ان کے بے پردہ چہرے بھی عربوں کی حمیت کو جگا نہ سکے تھے۔ وہ سب جو کعبۂ علم و فضل تھے۔ شرافت کو جن سے نسبت پر ناز تھا۔ کمزور اور بیمار زین العابدین کے سوا ختم کر دیے گئے۔ بتول کی کھیتی کو گن ہوں اور جبر و ظلم نے مار دیا۔ وہ سر جو عزت کو بھی محترم تھے۔ نیزوں پر لٹکائے اور خاک میں روندے گئے۔ آلِ علی رضؓ پر دنیا تنگ کردی گئی۔ وہ جو کئی ناطوں سے وارث تخت و تاج تھے۔ مالک عز و جاہ تھے۔ مکتبوں اور خانقاہوں میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ وہ سر دنیا کو جن کی سرداری پر فخر ہوتا، سرِ دار جھولتے رہے۔ علی ابن ابیطالب پر جمہوریت اسلام کا خاتمہ ہوگیا۔ اگر اسلام کو حضرت عمر رضؓ جیسا محتسب چند سال اور مل جاتے تو حضرت علی رضؓ نجفِ اشرف میں نہ سوتے۔ حسین رضؓ کربلا میں شہید نہ کئے جاتے۔ آخری امام غائب نہ ہوتے تاکہ سکون و امن و آشتی و نیکی کے دور کو لے کر پھر سے پیدا ہوں۔ کئی لوگ امام غائب ہونے اور مہدی موعود ہونے کا دعویٰ نہ کرتے۔ دنیا کو ایک نئے عہد اور نئے حاکم کا انتظار نہ رہتا۔ قرآن

کے لئے کسی تاویل کی ضرورت نہ پڑتی - امیر معاویہ نہ ہوتے تو یزید نہ ہوتا - اپنی خباثت کی طاقتوں کے ساتھ وہ اس قافلے کو تہس نہس نہ کرتا - جو فلک کے ستاروں سے زیادہ روشن تھا اور جس کے غبار راہ بننے کے لئے لوگوں نے ایمان کے حصنِ حصین میں رخنہ اندازیاں کی ہیں - غائب امام پر ایک ہزار سال گزر چکے - دنیا زار و زبون و دردمند ہے - ان کا ظہور ہونے والا ہے - جب جب دنیا میں ایمان والے خوار ہوئے ہیں - نیک لوگوں کو سولی پر چڑھایا گیا ہے - ذلیل و خوار کیا گیا ہے - شوق کی لے تیز کر کے خانقاہوں میں بیٹھے لوگوں نے تسلی دینے کے لئے خدا کے حضور دعا کی ہے کہ مہدئ موعود کا ظہور ہو - وہ آئے جس کا صدیوں سے انتظار تھا وہ آئے اور شیطان لوگوں کو قرار واقع سزا دے - وہ آئے اور زمانے کی چھوٹتی ہوئی نبضوں کو اپنے مسیحا صفت نفس سے پھر تندرست کر دے - وہ قائم آلِ محمد بالآخر آلِ محمد کو ان کا جائز حق ان کا تخت و تاج، ان کی شہنشاہی اور ان کی نیابت میں نظامِ حیات کو پھر سے راہِ ہدایت پر چلائے -

سارے مذہبوں نے ایسے آنے والوں کی بشارت دی ہے - جب زمین تنگی اور کفر سے بھر جائے گی - چاند روشنی نہ دے - ستارے آسمان سے گر پڑیں تو پھر وہ اپنے فرشتوں کو صور کی بڑی آواز کے ساتھ روانہ کر دے گا - تمام کتابوں میں صلح و سلام کے روشن زمانے کی آمد کا وعدہ کیا گیا ہے -

آلِ محمد میں اس ظلم و جور کے خلاف دبی دبی چنگاریاں ہمیشہ کبھی کبھی آس پاس کے خس و خاشاک میں لو دینے والے شعلے لہو بھرے چراغ بن جائیں - یہ امید صرف انہی کی نہیں سارے عالمِ اسلام کی تھی کہ وہ مسند عز و خلافت جس سے وہ اسلام کے اول دور میں محروم کر دیئے گئے - ان کے لئے پھر سے سجائی جائے آلِ نبی کا وہ قافلہ جو بے آسرا ہو گیا تھا اپنے اوج سے اپنے جاہ و نسب کی بزرگی پر متمکن ہو

شیخ احمد احسائی اپنے درس میں روز و شب کے تسلسل اور تسلسل حیات کے معانی سمجھانے میں مصروف تھے - جب انہوں نے کاظم رشتی کو دروازے میں کھڑے دیکھا - وہ صفوی بادشاہوں کا جاہ و جلال کچھ مٹا مٹا سا اپنی پیشانی پر لئے حضرت موسیٰ کاظم کی وساطت سے اپنے حسب و نسب کو یاد کرتے ہوئے بہت دور سے سفر کرتے آئے تھے - گرد سفر پلکوں سے لے کر ان کے جوتوں تک پر تھی - وہ تھکے ہوئے تھے اور ان کی متجسس نگاہیں متلاشی تھیں - جیسے جگہ کو پہچان رہی ہوں - رویا میں دیکھی صورتوں کو وہ ڈھونڈ رہے تھے جیسے ہجر و فراق کے جنگلوں کو پار کر کے زمانوں کی دوری سے دو روحیں ایک دوسرے کی طرف بڑھیں - شیخ احمد احسائی کچھ کہے بنا انہیں ہاتھ سے پکڑ کر لائے اور مسند پر اپنے قریب بٹھا لیا -

"ہاں وہ رویا اگر صادق نہ ہو تو میں دار پر چڑھایا جاؤں - لائق تعزیر ٹھہروں" شیخ احمد احسائی بنا

کچھ کہے سنتے رہے۔ وہ محض مجتہد ہی نہیں ان کے امام تھے۔ آلِ رسول سے محبت کرنے والے دل نے سید کاظم رشتی کی بات کو تسلیم کر لیا۔ وہ سر جھکائے روداد سفر سنتے رہے۔ شام اپنے چراغوں اور اذانوں سمیت اپنی نرم روی کے ساتھ زمستانی ہوا کی تیزی کے ساتھ شیخ احمد احسائی کے دروازے کے باہر منتظر رہی۔ جیسے زمانے منتظر تھے۔ جیسے اہل بیت پاک کے خون کو یزید پر مباح قرار دینے والے چپ رہنے والے ظلم کے خلاف اپنی زبانیں بند رکھنے والے سب ہی انتظار کر رہے تھے۔ کچھ نہ کچھ ہونے والا تھا۔ کئی صبحیں اور شامیں منتظر رہیں۔ وہ دونوں کسی مسئلے میں الجھے تھے اور سرگوشیاں ہولے ہولے پھیل رہی تھیں۔ وہ دونوں اپنی جان پر اتنی سختی کیوں کر رہے تھے۔ دونوں پاک روحیں مراقبے میں تھیں۔ وہ نگاہیں سب سے پھیرے کائنات کے نہاں خانوں میں جانے کس شے کی تلاش میں تھے؟ وہ خدا کی رضا کو پہچاننے والے اور احکام خداوندی کا مطلب سمجھنے والے کیا کہنے والے تھے؟ وہ جب اس لمبی بے جھپکی کے نیند سے اٹھیں۔ جس میں ان کی ارواح کہیں اور تھیں جانے کیا ہونے والا ہو؟ کاظم رشتی ٹھہرے رہے اور اپنے مرشد کے درس میں شریک رہے۔ انہوں نے وہیں رہ کر قائم آل محمد کا استقبال کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ انہوں نے لفظوں کی ظاہری ہیئت سے ان کے اندر اتر کر نئے معانی جان لئے تھے۔ شریعت اور طریقت۔ غائب اور ظاہر کے نئے حیران کرنے والے عجیب معانی تبابت اور ظہور کے نئے مطالب۔ سر جھکائے وہ درس میں شریک رہتے۔ اتنے صبر سے وہ اس ایک حجاب کے منتظر تھے۔ جو زندگی کا مطلب اور حاصل ہو گی۔ ملا صالح قزوین میں وہ بے بدل مجتہد اور عالم ایران کے طول و عرض میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس زندیق کے خوف سے لرزاں رہتا تھا جس کے متعلق خبر ستاروں کی چالیں جاننے والے آتش پرستوں اور اعتکاف میں بیٹھے بزرگوں نے دی تھی۔ کاظم رشتی اپنے تار تار عمامے کو سنبھالتے اپنی بشارتوں کے لئے قزوین اور شیراز کی طرف دیکھتے تھے۔ انہیں دو تجلیوں کی بشارت ملی تھی۔ امام غائب کے ظاہر ہونے کا زمانہ قریب تھا۔ وہ جو مہدئ آخر الزماں ہو گا اور نجات دہندہ بھی۔ جو گناہوں سے بھری فسق و فجور سے سڑتی اس دنیا کو پھر سے اس کا عزت کا مقام دلائے گا۔ آلِ محمد میں سے اس کا ہونا اتنا ہی ضروری تھا۔ جتنا امام غائب کا آلِ علی میں سے ہونا۔ چاروں طرف پردے ہی پردے تھے۔ حجاب ہی حجاب۔ ایران کی شان کے دن اب قصۂ پارینہ بن چکے تھے۔ شکست خوردہ قوم قاچار خاندان کی عمل داری میں نہایت ذلیل معاہدوں کے بند حصنوں میں بند ہو چکی تھی۔ ہر جگہ بیکسی اور ذلت کے سوا کچھ نہ تھا۔ فاتحوں کی اولادیں اب قہر گمنامی میں بسر کرتی تھیں اور صفحۂ ہستی سے مٹ چکی تھیں۔ ہلاکو کی ایلخانی نسلیں سورج کو پوجنے

والے صحرائے گوبی کے جنگلی قبیلوں کا خس و خاشاک، شان و شوکت والے ہخامنشی۔ جام جم والا جمشید کے ہم نسل آل سلمان ساسان۔ اسلام کی شان سے نوازے گئے بنو عباس، سلجوق۔ تیموری صفوی اور غم حسین کو ماتم کے ذریعے پھیلانے والے آل بویہ سب اپنی اپنی بساطیں سمیٹ کر چلے گئے تھے۔ ہزار سال بیت ہوتے ہیں۔ کربلا اور نجف اشرف میں نوحہ خوانی کے بعد امام غائب کا انتظار تھا۔ جیسے شیخ احمد احسائی اور کاظم رشتی کو تھا۔ یہ بادشاہتوں کی سرزمین اب پھر پرانے دنوں کی طرح دوسروں کی زد میں تھی۔ کعبہ کی حفاظت کرنے والے تاتاری بھی ایک ایسے مصلح کی راہ دیکھتے تھے جو دلوں کے اندر حرارت ایمان اور روشنی پیدا کر سکے جو نئی امیدیں دے سکے جو آرزوؤں کے چمن زاروں کی پھر سے آبیاری کرے۔

وہ ہمیشہ سے ایک خواب دیکھتی آئی تھی۔ خواب جس میں دھندلی صورتیں تھیں اور واضح صورتیں تھیں۔ مگر جن کے چہرے اس سے ہمیشہ چھپائے جاتے تھے۔ اس نے دیکھا کہ امام رضا کا روضہ شق ہو گیا اور اس میں سے لوگ نکلے مگر وہ لوگ اجنبی بھی تو نہیں تھے ان میں وہ خود بھی شامل تھی بے منزل کے قافلے کی طرح وہ چلتے جاتے ہیں اور آخر ریت کے ٹیلوں میں اپنا راستہ کھو دیتے ہیں۔ یہ راستے نہایت سرسبز و شاداب باغوں سے شروع ہوتے ہیں۔ جیسے دریا ہوں لہراتے ہوئے پانیوں کے ساتھ آخر صحرا میں جا کر ختم ہو جائیں۔ ایک سے زیادہ بار جب اس نے یہ خواب دیکھا تو وہ اس اشارے کا مطلب جاننے کے لئے بیتاب ہوئی۔

امام غائب پر یوں بھی ہزار سال گزر چکے تھے کیا یہ کوئی ایسا اشارہ تھا؟

"جان پدر اس کے باپ نے کہا تم فلسفے کی کتابوں میں کھوئی رہتی ہو۔ یہ پریشان خیالی ایسے خواب پیدا کرتی ہے۔ عورتوں کو امام غائب کے آنے اور ظہور آل محمد سے خبر نہیں دی جائے گی یہ بات کہہ کر ملا صالح ہنسا۔

ام سلمیٰ نے نہایت بیزاری سے باپ کی طرف دیکھا۔

تمہیں میری یہ بات پسند نہیں آئی۔ اس کے باپ نے کہا مگر سوچو تو سہی اگر کسی بشارت سے آگاہ کرنا ہو گا تو وہ خانقاہ میں بیٹھے کسی بزرگ کو کرے گا۔ کسی لڑکی کو نہیں۔

"میں یہ تو نہیں کہتی کہ یہ کوئی بشارت ہے مگر ہر روز یہ خواب مجھے پریشان کرتا ہے۔ آپ کا خدا پھر کسی لڑکی کو یہ جلوے کیوں دکھاتا ہے"

میرا اور تمہارا خدا والعیاذ باللہ کیسے کفر کے کلمات ہیں۔ تم چند دنوں کے لئے بجنت آباد چلی جاؤ۔ تم

اور مرضیہ وہاں مرغزاروں اور کھلی ہواؤں میں رہو اور کتابوں کو یہیں پر رہنے دینا " خانم اس نے اک کی ماں سے مخاطب ہو کر کہا۔ لڑکیوں کو تیار کر دو۔ پچھلے پہر سوار یاں ڈیوڑھی پر لگ جائیں گی۔"

مرضیہ میں نے ابھی ابھی ایک عظیم خواب دیکھا ہے۔ "عظیم اور دہشتناک"

" خواہرم "، اس نے بستر میں اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میں نے سوچا تھا خواب یہاں تمہارا پیچھا نہیں کریں گے۔"

" مجھے پتہ نہیں چل رہا مرضیہ یہ خواب کا اشارہ کیا ہے اور میں اس میں کیوں ہوں" ام سلمیٰ نے کہا۔

" تمہارے یہ خواب ختم ہو سکتے ہیں اگر تمہاری شادی کر دی جائے۔ ہمارا ابن زاد نجف اشرف سے واپس آنے والا ہے "، اس نے جھک کر بہن کی پیشانی پر پیار کیا۔

فیروردین کی پہلی تاریخیں تھیں۔ شاہراہوں پر گھنٹیوں کی صداؤں سے معلوم ہو رہا تھا کہ قافلے بڑی شاہراہ سے رات کے پچھلے پہر گزرنے لگے ہیں۔ دور سے آتے ہوئے لوگ ان راستوں پر جو قراقرم اور صحراؤں کو مغرب کے پہاڑوں کے اس طرف سلطنت عثمانیہ کے پایۂ تخت سے ملاتے تھے پھر چل پڑے تھے۔ سرخ اونٹوں پر تجارت کے مال کے انبار عود ولوبان لئے اجنبی زمینوں کی طرف رواں سوداگر جن کے دل میں نفع کمانے کے ارمان تھے انوکھے رواجوں والے ملک دیکھنے کی شدید آرزو تھی۔ جو ایران اور طہران سے پرے ملک ختنا تک جاتے تھے۔ پر اسرار پہاڑوں کی بلندیوں سے پرے زرد چہرے والے لوگوں کا ملک جہاں عورتیں باہر نہیں نکلتیں اور چھوٹے پاؤں کی وجہ سے جن کے لئے چلنا پھرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

" مرضیہ " اس نے بہت دکھ سے کہا " یہ خواب باقی خوابوں کی طرح نہیں۔ مشہد میں جناب امام کے روضے کا شق ہونا۔ کیا تم اسے معمولی بات سمجھتی ہو۔ ایک چہرہ جو پردے میں ہے۔ اور میں کوشش کے باوجود اسے دیکھ نہیں پاتی۔ بخدا میں اس ایک چہرے کو دیکھنے کے لئے اپنی زندگی دے سکتی ہوں۔ آئینوں کی ایک لامتناہی قطار جس میں وہ جلوہ فگن تھا۔ خود ہی حجاب اور خود ہی آئینہ۔ ہاں مرضیہ سنو اس نے بہن کو جھنجھوڑ ڈالا۔ خود ہی آئینہ آگے پیچھے اوپر نیچے دور تک وہی ایک ضو فگن اور خود ہی منزل اور خود ہی راستہ ان ایوانوں میں آپ ہی آپ آواز بھی اور اس کی صدائے بازگشت بھی۔ آنکھ اسے دیکھ نہ سکتی تھی کہ وہ سامنے تھا اور مجھے تاب نظارہ نہ تھی۔ ذرہ آفتاب کو پا سکتا ہے؟ میں جو زندگی کے لئے گیت کی تلاش میں سرگرداں ہوں۔ جیسے چھوٹی چڑیا یا عقاب کے پروں پر بیٹھ کر گیت کے ٹھکانے تک جانا چاہیئے۔ وَفِيهَا يُسْمَعُ نِدَاءُ اللهِ مِنْ سِدْرَةٍ فِيْ سَبِيْلٍ رَفِيْعٍ ۝

باب سوم

برقعہ پوش پیغمبر مور کی لالہ رخ کا ایسا بڑا کردار جس کے گرد اس نے رومانی کہانی بُنی ہے مغرب کے فاصلے سے انگریز شاعر کو اس میں پراسراریت دکھائی دی ہوگی۔ مگر اصل میں آگ اور ہوا کے بنے ہوئے ایرانی مذہبوں میں زمانے کا مقابلہ کرنے اور اپنا آپ ثابت کرنے کی تاب نہ تھی۔ وہ طلوع سحر کی شبنم تھے کہ سورج کی تاب نہ لا سکتے تھے اور پرتو خور سے فنا ہو جاتے تھے۔ اسلام یوں بھی مجاہدہ ہے۔ اپنے آپ سے اور باقی دنیا سے بیک وقت نبرد آزما رہنے کا ایک لائحہ عمل ہے۔ اس میں نہ وہ اسرار ہے جس کی رومان پسند طبیعتوں کو تلاش ہوتی ہے اور نہ ہی وہ آسودگی ہے جو صرف بیٹھنے سے آنکھیں بند کر کے لو لگانے سے حاصل ہوتی ہے۔ انسان کو انسان بننے اور بنے رہنے کے لئے ریاضت محنت کرنا پڑتی ہے۔ ایک جادہ مستقیم جس پر چلنے کے لئے دل و نظر کی ساری قوتیں بروئے کار لانا پڑتی ہیں۔ خارجی اور داخلی تضاد نہیں ہے اور ایک آدمی کو دوسرے آدمی پر فضیلت اور بزرگی محض اس کے کردار کی وجہ سے ہے۔ خدا نہ انسانوں میں حلول کرتا ہے نہ انہیں اپنے مرتبے بناتا ہے اس لئے کہ وہ آدمی کی شاہ رگ کے بھی قریب ہے۔ اوتاروں کی گنجائش نہیں۔ خود پیغمبر اسلام کے اخلاق اور زندگی ایک عام آدمی کی زندگی تھی۔ جس میں باطن کی صفائی ظاہر پر اثر انداز ہوتی تھی۔ برقعہ پوش جولستہ قد، بدوضع اور بھونڈی شکل کا آدمی تھا۔ نقاب پہن کر اپنے مریدوں سے پوشیدہ ہوتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو خدا کہتا تھا اور دل کے عقیدے کو اعمال ظاہری سے الگ قرار دیتا تھا۔

محمد مہدی بن منصور کے عہد میں اس فتنے نے سر اٹھایا تھا۔ بہت سے لوگ اس کے ماننے والے تھے اور ان معجزوں اور سحر بیانی میں یقین کر سکتے تھے۔ جو اس نے اپنے خدا ہونے کی وجہ سے اپنے اندر پیدا کر لی تھی۔ پھر اس زمانے میں بحیرہ خزر کے مشرق میں جرجان میں سفید پوشوں

کے مقابلے میں سرخ پوش پیدا ہوئے اور ایران نئے مذہبوں کی آماجگاہ بن گیا۔ یہ شورشیں بہت مشکل سے فرو ہوئیں اور شاہی فوجوں کو اس میں الجھنا پڑا۔

پھولوں، سبزہ زاروں، برف پوش پہاڑوں اور کہانیوں کی سرزمین ایران اکثر و بیشتر ایسی داستانوں کو پیدا کرتی رہتی ہے۔ رستم و سہراب کی یہ سرزمین، ہخا منشیوں کی یہ سرزمین۔ ام سلمیٰ کا یہ اضطراب بجا تھا۔ جانے یہ برقعہ پوش کون تھا اور اس کے خواب کیا تھے؟ ان خوابوں میں کیا اشارے تھے۔ ان اشاروں کا مطلب کیا تھا۔ ہمیشہ ایک ہی تعداد کیوں ہوتی تھی۔ وہ کس کو یہ سارے خواب سنائے بالقول اُس کے باپ کے یہ علم الہیات پڑھنے کا نتیجہ تھا۔ پہلے پہل بہت بچپن سے اس نے جب اپنے بابا سے اپنے خوابوں کا ذکر کیا تھا۔ تو انہوں نے اسے کہا تھا کہ وہ کم پڑھا کرے۔ کم پڑھنے کے باوجود یہ سلسلہ نہیں رکا۔ پہلے کے خوابوں میں آوازیں تھیں۔ جو پرانے ایوانوں اور کھنڈروں میں سے آتی تھیں کبھی اسے پکارتی ہوئیں، کبھی صرف سرگوشیاں کرتی ہوئیں۔ اس کا نام جیسے کوئی تسبیح خوانی میں مصروف ہو۔ چاروں طرف سے بڑھتا اور یورش کرتا ہوا، پانی اور ہوا، آگ اور خاک سب میں سے ایک ہی صدا آتی ہوئی یوں جیسے شام کے بڑھتے سایوں میں جنگل کی آواز ہو۔ ان سینکڑوں قسم کی مخلوقات کی تسبیح مسلسل ہو۔ جو خدا کی حمد کرنے میں نہ کسی صلے کی پرواہ کرتے ہیں اور نہ ہی جنت کے خریدار ہیں۔

مرضیہ نے ضدی بچے کی طرح کہا یہ تمہارے پریشان خواب اور کیا ہیں۔ آخر تم ہمیشہ ایک صورت کو دیکھتی ہو جس کا چہرہ تم سے پوشیدہ ہوتا ہے۔ ام سلمیٰ یہ عروس کا چہرہ ہے جو روز روشن کی طرح تمہارے بخت پر چھا جائے گا۔ جب تمہیں دکھائی دے گا تو تمہیں خوشی نصیب ہوگی۔ میں کہتی ہوں۔ تمہارے خواب کا اور کچھ مطلب نہیں۔

ملا محمد نجف اشرف میں اپنی تعلیم مکمل کر رہا تھا

تاکہ اپنے باپ اور چچا کی طرح مجتہد بنے۔ کم گو اور اپنے متعلق پریشان رہنے والا نوجوان، تعلیم میں ہوشیار ہونے کے باوجود اسے وہ ہوشیاری نہیں ملی تھی۔ جس کو ذہانت کہتے ہیں۔ پھر مدرسوں اور خانقاہوں کے مدرسوں میں مذہبی تعلیم کے وہی گھسے پٹے اصول تھے جن کی راہیں کہیں نہیں جاتیں۔ بادشاہ کے بعد سب سے بڑا درجہ مجتہد کا ہوتا تھا۔ جس کی کشش لوگوں کو دنیاوی جاہ و جلال کے شوق میں وہاں لے جاتی تھی۔ صفوی بادشاہوں نے چونکہ پورے ایران کو اپنا مذہب اختیار کرنے کی طرف مائل کر لیا تھا اور یوں بھی حکومت کا عقیدہ عوام کا عقیدہ ہوتا ہے

دربار کی زندگی کی نقل کرنا رعایا کے لئے باعث فخر ہوتا ہے۔ بادشاہ نے شیعہ مذہب کو رواج دیا علما کو مخصوص دینی مسائل کی طرف متوجہ کیا اور اس رسمی مذہب سے لوگوں کی عقیدت کو استوار کیا علم وادب پس پشت چلے گئے تھے۔ گو اس طرح پیدا کی ہوئی وحدتِ ملی آج تک قائم ہے مگر روحانی اسرار و رموز اور ان کاوشوں سے پیدا شدہ ایک منجھی ہوئی سوچ سے لوگ محروم ہو گئے۔ لوگ مرثیہ گو تھے۔ قصیدے صرف آئمہ کے لئے کہے جاتے تھے۔ قاچار خاندان والوں نے بھی اس میں کوئی خاص تبدیلی نہیں کی وہ بھلا اس وحدت کو کیسے توڑ سکتے تھے۔ صوفیوں کے خلاف جو تحریک چلی اس نے نجفِ اشرف اور کربلائے معلیٰ کے علاوہ کم وبیش تمام مذہبی درس گاہیں حکماً بند کرا دیں۔ ایران کا سرود و نغمہ اپنے وطن سے رخصت ہو کر ہندوستان جا بسا۔

ایسے ماحول میں ملا محمد کی طبیعت کبھی رعنائی کی طرف مائل نہیں ہوئی۔ وہ بہت سنجیدہ اور اپنے صاحب اختیار ہونے کو سمجھتا تھا۔ اسے اپنے چچا کی دونوں لڑکیوں ام سلمیٰ اور مرضیہ سے چڑ تھی ام سلمیٰ اس کے نزدیک خود مذہبی میں مبتلا تھی۔ ایران کے دستور کے خلاف وہ باپ کے کتب خانے کا آزادانہ استعمال کرتی تھی اور اسے ایسی باتوں سے بھی آگاہی تھی۔ جنہیں جاننا عورتوں کے لئے معیوب خیال کیا جاتا تھا۔ وہ شعر کہتی اور رؤیا پر یقین رکھتی تھی۔ وہ بلا کی نکتہ چین اور مغرور تھی۔ اس کو حافظ کا کلام یاد تھا اور وہ سرود پرایے گا سکتی تھی۔ وہ اس سارے فسق و فجور میں مبتلا تھی اور خاندان میں سب جانتے تھے کہ اس پر عجیب حالت طاری ہو جاتی ہے۔ جب وہ نہ کسی سے بولتی ہے اور نہ کچھ کھاتی ہے۔ پہروں سکرات کی سی کیفیت میں رہنے کے بعد اٹھ کھڑی ہوتی ہے طبیبوں نے اس کا علاج یہ بتایا تھا کہ یہ خیالات کی زیادتی ہے جو ذہن میں نہیں سماتے۔ جیسے سمندر کی لہریں چودھویں کے چاند کی کشش سے دیوانگی کی حد تک بڑھتی ہیں۔ ایک بزرگ جو اہلِ سنّت سے تھے اور طبیب بھی تھے اور صوفیا سے بھی انہیں شغف تھا۔ ملا صالح سے کہتے تھے کہ اگر یہ شعر کہنے کی طرف مائل ہو تو اچھا ہے۔ طبیعت کی موزونی کا اس سے بہتر مصرف کوئی نہیں ہے ام سلمیٰ تو بچپن سے شعر کہتی تھی۔ مگر وہ شعر آئمہ اور معصومین کی تعریف میں نہیں ہوتے تھے وہ مرثیہ نہیں شعر کہتی تھی۔ جس میں اس صورت کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے بیتابی تھی وہ بچوں کی سی تک بندی نہیں تھی۔ ایک بھرپور خاتون کے عشق کا فسانہ تھا۔ پتہ نہیں اسے کس سے عشق تھا؟ بادلوں کے بنتے بگڑتے دھوئیں کی طرح ہر شے پر محیط ہوتے سمٹتے سکڑتے حاشیوں اور صورتوں کو وہ پہروں تکتی اور پتہ نہیں کیوں اس کا دل بھر آتا۔ وہ کون تھا جو پوشیدہ

اور اس کے دل کا صبر و سکون اس کی زندگی کا قرار چھین چکا تھا۔

گر بتو افتدم نظر چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو شرح دہم غم ترا نکتہ بہ نکتہ مو بمو

وہ کون تھا جس کی تلاش اس کی جان کو تھی؟ بے نام فاصلے، نامعلوم راستے اور سفر کی شدید آرزو۔ یہ احساس گداز کیوں۔ التہاب کیوں۔ کیا شے تھی جو ماورا تھی اور پھر بھی تھی اور اک سے پہنچ سے باہر اور پھر بھی دل کے اندر۔ اور نورانی ہیولی جو تھا بھی اور نہیں بھی۔ فصل بہار آتی اور نکل جاتی گرمی آتی دریا اور ندیاں پانی سے بھرتیں۔ آبشاریں۔ سیلاب۔ برستی بارش۔ جنگلوں پر گرجتے بادل صحراؤں کی طرف سے چلتی ہوائیں، دور دراز سے آتے قافلے، حنا کا ریشم لانے والے اونٹوں کے گلے میں پڑی گھنٹیاں۔ اس شاہراہ سے مشرق و مغرب میں آتے جاتے لوگ زیارت گاہوں کے گرد گھرا کئے دعائیں مانگتے زائرین۔ سمرقند پر حافظ کے اشعار کی لے۔ عمر خیام کی شاعری جس میں موت بھی اتنی ہی خوشگوار لگتی ہے۔ جتنی زندگی۔ جھلملاتے ہوئے بنا سوال کئے گزر جانے والے سال و ماہ آرزو کی شدت اور پھر کتاب اور پانی کے کنارے معشوق کے ساتھ چپ چاپ موت کی آغوش میں سو جانے کی حسرت۔ بساط پر پھیلے مہروں کی سی حیات جنہیں موت جب چاہے اٹھا کر قسمت کے ڈبے میں بند کر دے۔ نیشاپور کے نجومی شاعر نے عجیب طرح کا فلسفہ سمجھایا تھا۔ جو یوں تو قابلِ یقین تھا مگر نہیں بھی۔ اس کی پھولوں سے ہر موسم میں ڈھکی ہوئی قبر پر جا کر اس سے سوال کرنے کو جی چاہتا ہے۔ تم نے اپنے لئے ایسی جگہ پسند کر لی۔ جس پر بادِ شمال اور بادِ جنوب گل فشانی کرتی ہیں کوئی ایسا راستہ ہے کہ ہر انسان جو چاہے اپنے لئے منتخب کرے۔ آزادی کیا ہے؟ تم آخر قسمت کو کیوں کر اپنے قابو میں کر سکے۔ تم نے ایسا کس طرح کیا؟

یہ زندگی کی لاحاصل اس کے کچھ نہ ہونے پر دلالت آدمی کی بے بسی اس کی مجبوری قسمت پر شاکر رہنے کے لئے ایک تاریک فلسفہ زمانے کی بے ثباتی اور اس کی کم مائیگی انسان کے لئے نہ کوئی راستہ ہے اور نہ ہی کوئی امید ہے۔

جہاں کبھی جمشید کا پایۂ تخت تھا وہاں درندے اپنی مجلسِ مشاورت کرتے ہیں۔ جام جم والے بادشاہ کی ہنسی اڑاتے ہیں۔ اور بہرام کے مقبرے پر جنگلی گدھے وہاں اپنے پاؤں مارتے ہیں۔ جہاں اس کا سر ہے مگر وہ سویا ہوا ہے۔

جہاں صوفی اور عالم بیٹھتے، اپنی مجلسیں بپا کرتے اور مابعد الطبیعات سے متعلق موشگافیاں کرتے تھے۔ وہ نبیوں اور ولیوں کے لفظوں کی سچائیاں ڈھونڈتے اور انہیں جھٹلاتے تھے۔ وہاں خاک

اڑتی ہے اور ان کی زبانیں خاک سے اٹ گئی ہیں۔ ساری چیزیں جھوٹ ہیں۔ صرف ایک بات سچ ہے کہ جو پھول ایک بار کھلتا ہے وہ مرجھا کر خاک میں مل جاتا ہے۔

بے ثباتی عالم کے اس فلسفے میں مایوسی اور اندھیرا تھا۔ تقدیر پر اندھا یقین تھا۔ جو کچھ ہے وہ کسی طاقت سے تمہاری تمناؤں سے تمہاری آرزوؤں سے بدل نہیں سکتا۔ تم لاکھ سر پٹکو کچھ نہیں کر سکتے۔ ہاں جو کچھ ہونے والا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ زندگی کی گہما گہمی پر ہولے ہولے موت کی گرد چھا جاتی ہے۔ موت سفینوں کو ڈبو نے والی فنا۔ فنا۔ یہ انحطاط مایوسی کا سبق تھا۔ چھین کر جھپٹ کر کامیابی سے ہمکنار ہونے، لہو گرم رکھنے کے بہانے بہت کچھ کر گزرنے کا سبق نہیں تھا۔ نیشاپور قزوین سے بہت دور تھا۔ ام سلمیٰ بیک وقت کتابوں کی دنیا میں رہنے والی اور رؤیا پر یقین رکھنے والی تھی۔ اس نے خود اپنی تربیت کی تھی اور اپنی نازکی کے باوصف اس نے سخت مراقبوں اور عبادتوں سے اپنے آپ کو اپنے اندر کی روشنی سے منور کرنا چاہا تھا۔ اس کے مطالعے نے کشف کی صورت اختیار کر لی تھی۔ علم و دانش جس کو آزمانے کے لئے کوئی جولانگاہ سیکھی ہوئی باتوں کی سچائی پرکھنے کے لئے وقت کی کسوٹی درکار تھی اسے اپنے باپ کے علاوہ کسی ایسے بے بدل مرشد کی ضرورت تھی جو اسکے شکوک و شبہات کو دور کر سکے اسے حوصلہ دے جینے کا اور اپنے آپ پر یقین رکھنے کا۔

کاظم رشتی نجف میں تھے۔ دور تھے اور اس کی راہنمائی کے لئے ان سے بہتر کوئی نہ تھا۔ مگر ملا محمد مجتہد بن کر واپس آ چکا تھا اور ملا صالح نے یہی بہتر جانا کہ ام سلمیٰ کا اپنا گھر ہو۔ اس کے مراقبے اور عبادتیں وظائف اور پردۂ اسرار سے پرے چیزوں کو جاننے کی تمنا اس کے رؤیا جو صادق تھے مگر الجھے ہوئے ان سب کے لئے ایک ہی تدبیر تھی کہ وہ اور ملا محمد مل کر زندگی گزاریں۔ یہ شعر سن کر :-

"ہو وہ طاقت و صبر ملے بخشم فراق تو تابہ کے

ہمہ بند بند مرا چو نے بود از غم تو حکایتی"

وہ سخت فکر مند ہو گیا۔ مشرق میں لڑکی سے اس کی مرضی کا پوچھنا معیوب خیال کیا جاتا ہے۔ ملا تقی اور ملا صالح سر جوڑ کر بیٹھے۔ نغمہ و خوشی کی پکار ہونے لگی۔ چپ چاپ جیسے کوئی اپنے آپ کو کشتی میں گرا دے کہ بلا سے اسے پار اتارے یا ڈبو دے۔ اس کی غرض نہ ڈوبنا ہے نہ بچنا۔ یوں نہیں کہ وہ ملا محمد کو پسند نہیں کرتی تھی مگر اس کے خواب دوسرے تھے اس کا ذہن خیالات سے یوں بھرا تھا جیسے ثمر سے باجھ۔ وہ سوچتی تھی اور فیصلہ کر سکتی تھی اس میں حوصلہ تھا اور بے انداز ہمت تھی اسے قصر نما گھر کی چار دیواری کے اندر رہنے کے باوجود جینے کے اور ڈھنگ بھی یاد تھے جو اس نے کتابوں سے

یکھے تھے۔ اس کے باوجود زندگی کے لاحاصل ہونے کا اسے شروع سے احساس تھا وہ اسے لاحاصل نہیں سمجھتی تھی۔ وہ ستاروں کی چالیں نہیں جانتی تھی مگر اسے اس بات پر یقین تھا کہ ستارے اپنا راستہ بدلیں گے۔ وہ وقت کے ہاتھوں مجبور اور منتظر تھی۔ اس کا خمیر جس مٹی سے تیار کیا گیا تھا۔ اس میں بے پناہ جوشِ نمو کی قوت تھی زور تھا۔ ایسی زمین جس کو زمستانی ہواؤں نے برف و باراں کے طوفانوں سے سینچا تھا۔ پہاڑی ندیوں کی تہہ میں بیٹھے سخت پتھروں کی طرح کو ان سختیوں سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتی تھی۔ اس کی روح جن جلووں کی آماجگاہ بننے اور جن تجلیوں کو دیکھنے کے لئے بنی تھی۔ افق پر ابھی تک اس کا دور دور پتہ نہ تھا۔ آسمان سرد اور تاریک تھا۔ دن جو صبح اور شام کے نہایت مختصر وقفوں سے چل رہے تھے، تیز ہواؤں کی زد میں آئے ہوئے تھے۔ درخت برف سے ڈھنپے ہوئے اور ننگے تھے۔ ہر شے آمد بہار کے لئے گویا انتظار میں تھی۔

تیرہ سال کی عمر روشنیوں سے آنکھوں کو چندھیانے کے لئے بنی ہے۔ دور کے خواب دیکھتی آنکھیں دنیا کے دام فریب میں ایک لڑکی کو باندھنے کے لئے مضبوط رشتوں سے بنی ڈوری پھر جیسے تناور درخت بننے کے لئے جڑیں اندر اندھیروں میں اتریں اور پھر اوپر آسمان کی طرف اپنی باہیں پھیلائے شاخیں ہوں۔ چکنے سبز پتوں سے لدی ہوئی پھولوں اور پھلوں کے ممکنات کو سمیٹتے ہوئے ڈالیاں۔ ملا محمد اور ام سلمیٰ کی زندگی کے درخت پر چہکار ہوئی بچی آن کے باغ میں کھیلے کچھ دن کے لئے سب کچھ بھول بھال کر وہ مگن ہو گئی۔ وہ ماں بن کر سیراب کرنے میں لگ گئی۔ جیسے اپنی زندگی کا کوئی مقصد سمجھ میں آجائے۔ قرآن میں رویا دیکھنے اور اس کا مطلب سمجھنے والی حضرت یوسف کی سی فراست رکھنے والی بالآخر زندان میں ڈال دی گئی تھی۔ جہاں اس پر یہ کشف بھی ہوا تھا کہ ایک عورت کی زندگی کا مقصد ڈھونڈنے کے لئے کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ خوابوں نے کچھ دنوں کے لئے اس کا پیچھا چھوڑ دیا تھا۔

وہ اب بھی شعر کہتی تھی مگر التہاب دبی دبی آگ شدید تر سناٹا کی سی کیفیت اب نہیں تھی۔ جیسے تھک کر حُدی خوان اپنی لے کو دھیما کر کے خاموش ہو جائے۔ جب ہوا بند ہوتی ہے اور گرج کی صدا سننے کے لئے کان کھلے ہوتے ہیں۔ بچوں سے پرے جب وہ نیلے آسمان میں اڑتے پرندوں کو دیکھتی تو ان کے پار دیکھتی چلی جاتی۔ سات پردوں کے پرے بھلا کون ہوگا۔ شوخ گستاخ اور بے پروا۔ ایک مشاق شہسوار کی طرح وہ سوچ کی طنابیں کھینچ لیتی۔ کیا اس کی زندگی بھرپور نہیں تھی جن چیزوں کی تمنا آدمی کرتا ہے وہ سب اسے نصیب تھیں۔ ملا محمد جیسا شوہر جو اس کی برتری کو تسلیم

کرتا اور اس سے ذرا ذرا خائف رہتا تھا وہ کہتا عروس پتہ نہیں تم نے اتنی کم عمری میں اتنا کچھ کیسے سیکھ لیا ہے ... وہ ایک ادائے ناز سے اسے جواب دیتی مگر اندر سے بجھ جاتی اسے تو ایک ایسے پتھر کی تلاش تھی جس کے ساتھ ٹکرانے سے چنگاریاں نکلیں دو یکساں غنیم جو آمنے سامنے صف آرا ہوں اور کوئی ایک دوسرے سے ہار نہ مانے، عاجز نہ ہو یا مقابلہ بھی ہو تو عدو کو ٹکر کا ہونا چاہیئے جو فنا کرنے پر قادر ہو۔ تقریباً مافوق الفطرت۔ اس نے بہت دنوں کے بعد محسوس کیا تھا کہ اس کی زندگی پھیکی اور بے مزہ تھی۔ وہ عروس تھی تو سہی مگر کس کی؟ ملا محمد تو کسی اور عورت کو جو ام سلمیٰ نہ ہوتی اسی طرح سے عروس کہتا اور اس سے جھینپتا۔ وہ ایک عام عورت کے ساتھ جس نے الٰہیات اور فلسفہ نہ پڑھا ہوتا۔ ایسے ہی خوش رہتا۔ روزمرہ کی سینکڑوں بار دہرائی جانے والی باتیں ایک ہی طرح کہتا۔ اسی طرح باہر سے آتا۔ بچوں کو دیکھ کر خوش ہوتا۔ وہ تو کسی اور نہایت معمولی عام زندگی سے خوش ہو جانے والی عورت کا حق غصب کئے بیٹھی تھی۔ اس نے بے چین ہونا شروع کیا۔

محمد کہتا "بخدا ام سلمیٰ تم کسی دلیل میں عاجز نہیں ہو مگر گھر کی مہشت کے لئے بہت سوچ سمجھ کچھ کام نہیں آتی۔ رواداری اور سہہ لینے کی قوت کافی ہوتی ہے۔"

تقریباً دس سال کے بعد جب اس کے بچے سمجھدار ہو رہے تھے اسے کچھ کچھ سمجھ آئی کہ شادی کا فیصلہ کبھی کبھار کتنا غلط ہوتا ہے۔ اس نے اپنی جوانی کا نہایت عمدہ حصہ بہترین حصہ ایک عام لڑکی بننے میں لگا دیا اس دیدہ ریزی کی کیا ضرورت تھی۔

باب چہارم

صفوی بادشاہوں نے مذہب کی دو سو سال تک جو غور و پرداخت کی اور اس کو رواج دینے میں جو تکلیفیں اٹھائیں ملک کو سطحی ملی وحدت بنانے میں جس جانفشانی سے کام لیا۔ اس نے اب ملاؤں کو نکتہ بنا دیا تھا ایک ایسا محور جس کے گرد ساری حیات گھومتی تھی۔ بادشاہ ان سے نہیں ان کی وحدت قوت سے ترساں رہتا تھا۔ تعلیم عام نہ تھی مگر خانقاہوں کا حکم، حکم آخر تصور کیا جاتا تھا۔ ایسے میں باہر سے جو بھی کہیں جاتا اس کا ملا سے ملنا اور مجتہد کے در پر حاضری دینا ضروری تھا۔ ملا محمد گھر آتا تو اکثر ایسی باتیں سناتا جو سینہ بہ سینہ اس تک دوسروں کے توسط سے پہنچی تھیں مغربی یورپین بحیرہ کیپسن سے پرے سیاہ سمندر سے دور کہاں سے کہاں پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے تہذیبوں کا الٹ پلٹ دیا تھا اور فاصلے مٹا دیئے تھے۔ وہ اپنے جہازوں پر ہر سلطنت کے دروازے پر دستک دے رہے تھے۔ کمزور حکومتوں کی اندرونی پالیسیاں ترتیب دیتے اور نہایت بے وقار معاہدوں میں انہیں الجھاتے تھے۔ وہ سرحدیں جو ناقابل عبور خیال کی جاتی تھیں کم بلند اور کم تر ہو گئی تھیں یوں بھی دنیا کبھی ایک حالت پر نہیں رہتی۔ ایسے میں جب باہر کی ہواؤں کو البرز کی چوٹیاں نہ روک سکیں تو اقصائے عالم سے شور کرتے ہوئے طرح طرح کے خیالات آزادی کے نعرے، نوحے اور خوشیوں کے تصورات اندر گھسے چلے آئے۔ ملا جو وحدتِ ملّی کے پاسبان تھے۔ کب تک حفاظت کے بندوں کی نگہداشت کرتے وقت مضبوط سے مضبوط طاقت کو کمزور کر دیتا ہے اور پھر اس محاذ پر اگر صف آرائی ہو سکتی تھی، حملہ کیا جا سکتا تھا۔ وہ کسی نئے مذہب کی تلوار سے ہی۔ جس کی کاٹ گہری جس کی اپیل عالمگیر ہو۔ جس کی آزادی میں اسرار ہو اور جو بھنوروں میں سب کو گھسیٹ سکے۔ ہزار سال ایک بہت لمبا عرصہ ہوتا ہے۔ ایمان کی آزمائش اور انتظار دونوں کے لئے۔

از پئے دیدن رخت ہمچو صبا فتادہ ایم
خانہ بخانہ دربدر کوچہ بہ کوچہ کو بکو

ملا محمد نے اندرونی صحن میں حوض کے پاس کھڑے ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ دالانوں کے پردے چھٹے ہوئے تھے۔ بچے اندرونی کمروں میں کہیں ہوں گے۔ کیونکہ ان کی آوازیں آرہی تھیں۔ صرف ہلکے ہلکے جیسے کوئی سسکیاں بھرتا اور پھر سانس روک لیتا ہو۔ سرود کی آواز آتی بھی تھی اور نہیں بھی۔ اس کے باپ نے ام سلمیٰ کو سختی سے منع کیا تھا کہ وہ حافظ کے اشعار نہ گایا کرے۔ عمر خیام کی رباعیاں نہ پڑھے اور شاعروں کو اپنا کلام لکھ کر نہ بھیجا کرے۔ غرضیکہ اسے پردہ دار شریف خواتین کی طرح اپنے آپ کو انہی حدود کے اندر رکھنا چاہیئے۔ جن میں اس سے پہلے گھر کی خواتین رہتی آئی ہیں۔ وہ سرود اچھا بجالیتی تھی تو اس سے کیا ہوتا تھا۔ ایک ایسے خاندان کی چشم و چراغ ہونے کی اور ان کے بچوں کی ماں ہونے کی وجہ سے بھی اس پر یہ لازم تھا کہ وہ آئندہ نسلوں کے لئے اگر سربلندی کا کوئی کام نہیں کر سکتی تو سر جھکانے کا باعث بھی نہ بنے۔ وہ کبیدہ خاطر وہاں سے اٹھ آئی تھی۔ گم سم آخر اس نے کیا کیا تھا؟

ملا صالح سمجھتا تھا کہ اس کے بھائی نے ام سلمیٰ سے نہایت نامناسب سلوک کیا ہے وہ اپنی بیٹی کی صلاحیتوں سے کچھ حد تک واقف تھا۔ وہ بڑی سوچتی ہوئی، چمکتی دور دیکھتی ہوئی آنکھیں اور جھپٹ کی سی تیزی سے باتوں کو سمجھنے کی اہلیت۔ مرضیہ اور ام سلمیٰ میں محبت کے ہونے پر بھی بڑا فرق تھا۔ وہ تو اپنی درخشندگی سے سورج کی سی تابناک تھی۔ اس نے بھائی کی بات ماننے اور علم کے سمندر کے کنارے کھڑی اپنی کم عمر بیٹی کو ملا محمد سے بیاہنے میں کوتاہ اندیشی سے کام لیا تھا۔ فضا کی آزاد بلبل کو انہوں نے مل کر پنجرے میں ڈالا تھا اور روزمرہ کی زندگی سے اس کے پروں کو باندھنے کی کوشش کی تھی۔ جس میں کسی حد تک وہ کامیاب ہو گئے تھے۔

آج مشرق سے آنے والے ایک قافلے سے سرائے میں جا کر اس نے ملاقات کی تھی اور ایک نادر آئینہ خریدا تھا۔ یہ آئینہ جس پر چینی کا دائرۂ وقت بطور آرائش مرتسم ہے۔ مرکز میں پرکار کے چار بنیادی نقطے، پھر بارہ جانوروں کا دائرہ۔ چوہا۔ بیل۔ چیتا۔ خرگوش۔ اژدھا۔ سانپ گھوڑا۔ بکرا۔ بندر۔ مرغ۔ کتا۔ سور۔ آٹھ پراسرار شکلوں کے دائرے سے باہر چاند کے ہیتی بروج دکھائے گئے تھے یہ تمام چیزیں چینیوں کے حساب وقت اور فال میں داخل تھیں اسے دائرہ ختا کہتے تھے۔ ام سلمیٰ کو عجیب و غریب چیزوں سے بہت شغف تھا۔ نئی کتابوں

سے اور پُراسرار خیالات سے اس نے ایک ایک کمرے میں جا کر جھانکا۔ تیز سرد جھکڑوں کے ساتھ برف کے گالے اُڑتے ہوئے آ رہے تھے۔ پہلی برف باری شروع ہو گئی تھی۔ آسمان بادلوں کے اندر چھپا ہوا اور بوجھل تھا۔ درمیانی کمرے میں آگ خوب تیز جل رہی تھی۔ خادمائیں بھی دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ اس نے پکارا۔ ام سلمیٰ عروس تم کہاں ہو۔ دیکھو میں تمھارے لئے کیا لایا ہوں۔

وہ اس اندرونی کمرے کی طرف بڑھا۔ جہاں ناراض ہو کر وہ کبھی کبھی متعکف ہو جایا کرتی تھی یا نہایت سوچ بچار کرنے کے لئے گویا مراقبے میں چلی جاتی تھی۔ جب اس پر شدید مایوسی کے دورے پڑتے تھے اور وہ مناجاتوں میں کھو کر اپنی گریا بیماری کا علاج کرتی تھی۔ قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہوئے روتی رہتی پھر اٹھتی اور شعر کہتی کہتی ہی چلی جاتی اور آنسوؤں سے اس کا چہرہ بھیگا ہوا ہوتا۔ وہ خود اور بچے اسے تنہا چھوڑ دیتے۔ بند دروازے پر اس نے دستک دی۔ پہلے نہایت آہستگی سے پھر ذرا تیز۔ پھر اس نے اسے پکارا۔ ابھی نماز کا وقت بھی نہیں تھا۔ کیا وہ پھر اس لمبے بیہوشی کے دورے میں مبتلا ہو گئی تھی۔ جس کی وجہ سے ملا صالح پریشان رہا کرتا تھا اور دوشیزگی میں یہ خطرناک بیماری اس کے ماں باپ اور بہنوں کو بہت پریشان کرتی تھی اور اسی لئے بھی وہ سب سے زیادہ چاہی جاتی تھی۔ جیسے نازک جلبی شیشہ ہو کہ اسے ٹھوکر سے بچانا لازم ہے پھر وہ رُدیا جن پر خاندان کے لوگوں کو یقین ہوتا بھی تھا اور نہیں بھی۔ انسان کو مستقبل میں دور تک دیکھنے والی آنکھ نہیں ملی۔ انسان عقل کے نہاں خانوں میں چاہے دور تک دیکھ لے مگر آنے والا زمانہ اسے نہیں ملا۔ پیغمبروں کو بھی بس بشارتیں دی گئیں ہیں یا پھر وہ ان بشارتوں کو عام کرنے کی اجازت نہیں رکھتے یا ہو سکتا ہے وہ احکام خداوندی کے تابع شہیدوں کی طرح خوشخبریوں کی اپنی جان سے حفاظت کرتے ہیں۔ آدمی کتنے آرام میں ہوتا ہے اگر اسے آنے والے دنوں کی خبر ہو جائے تو وہ مارے احتیاط کے کاروبار حیات میں ذرا دلچسپی نہ لے جانے وہ کیا کرے۔ آفرینندۂ روزگار کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے کہ اس نے فہم و ادراک کے ساتھ مستقبل کا بہت زیادہ علم آدمی کو نہیں دیا۔ اس نے امانت بھی دی ہے اور عافیت بھی" ام سلمیٰ عروس" محمد نے دروازے پر پڑے پردے کو اٹھایا۔ وہ سرود کے تاروں پر انگلیاں رکھے جانے کہاں دیکھ رہی تھی۔ کھلی آنکھوں سے جانے کن پردوں کے پار۔ اس نے دائرۂ خدنگ تاد الا آئینہ وہیں اس کے قریب رکھ دیا اور اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کئے بنا واپس آ گیا۔ اس عورت کے ساتھ اس کی ازدواجی زندگی اور مشکل سے مشکل تر ہوتی جاتی تھی۔

جمعہ کی نماز کے بعد ملا تقی نے اپنے بیٹے سے کہا کہ وہ ٹھہرا رہے جب گرم لبادوں اور چادروں میں لپٹے بڑے بڑے سموری کوٹ پہنے ہوئے باپ بیٹے گھوڑوں پر سوار ہو کر گھر کی طرف چلے تو لوگ دو دو چار چار کی ٹولیاں بنائے باتیں کر رہے تھے۔ شیراز کا نام بار بار سنائی دے رہا تھا۔ نماز سے پہلے ایک مسافر کہیں سے آیا تھا اور اس نے مجمع میں چند لوگوں سے ایک نئے فتنے کا ذکر کیا تھا۔ ایک نوجوان نے اعلان کیا تھا وہ "باب" ہے دروازہ جس کے ذریعے قائم تک پہنچا جا سکتا ہے۔ قائم آل محمد جس کی راہ دیکھتے لوگوں کو ہزار برس سے زائد کا عرصہ ہو چکا تھا۔ مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح یا جیسے ڈرے سہمے ہوں لوگ سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے زور سے نہیں بول رہے تھے ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے۔ کیا واقعی امام غائب کا ظہور ہو گیا ہے؟ کیا آلِ نبی کے دن پھرے ہیں۔ مہدیٔ موعود جو امام آخر الزماں ہوں گے جو دنیا میں عدل قائم کریں گے؟ مگر ان کا ظہور تو ارضِ پاک سے ہونا ضروری ہے بزرگوں سے سنے قصوں کو لوگ ابھی بھولے نہیں تھے۔ حسن بن صباح کی جنت جو اسماعیلیوں کے لیے اب بھی حقیقت تھی۔ اس دہشت گردی کا فسانہ جب لوگ بھرے مجمعوں میں قتل کر دیئے جاتے تھے۔ فدائین کا دور۔"

ملا تقی نے کہا "محمد ایک بار پھر دنیا فسق و فجور سے بھر جائے گی تم جانتے ہو" "نہیں پدر محترم" محمد نے احتراماً اپنے گھوڑے کو باپ کے گھوڑے سے ایک قدم پیچھے رکھا ہوا تھا "اصل میں تمہیں غور کرنے کی عادت بالکل نہیں ہے تم ذہین بھی نہیں ہو۔ یہ میری بدقسمتی ہے کہ مجھے اپنے بھائی کی بیٹی مانگنا پڑی۔ مولا کی قسم تم اپنے گردو پیش کی دنیا سے نہایت بے خبر ہو" "جی پدر محترم" اس نے پھر سر جھکا کر کہا۔

ملا تقی نہایت وجیہہ بہت شاندار جاہ و جلال سے اپنے گھوڑے پر جم کر بیٹھا تھا جو برف پر سے تقریباً پھسلتا ہوا چل رہا تھا اور جس کے نتھنوں میں سے بھاپ نکل رہی تھی سیاہ عربی النسل بلند اور مضبوط اپنے سوار کے شایانِ شان۔ محمد میں علم کا حلم تھا انکسار بھی تھی اور جس طرح بہت بڑے درخت کے سائے تلے چھوٹا درخت پروان نہیں چڑھ سکتا وہ اپنے باپ کی وجاہت کا حصہ دار ہونے کے باوجود اس سے کمتر لگتا تھا۔ اسے عبادات سے شغف تھا اور وہ ایمانا غالی شیعہ تھا۔ راسخ العقیدہ شیعوں کی طرح امام غائب پر نہایت یقین رکھتا تھا۔ امام حسن عسکری کے بیٹے کے غائب ہونے پر اعتقاد مذہب کا ایک حصہ تھا اور

اسی پر گویا شیعہ مذہب کی اساس تھی۔ اثنا عشری جو ظہور امام کے منتظر تھے۔ پورا ایران گویا تپتے دلوں کو لئے ہزار سال کے بعد پوری ہونے والی پیشین گوئی کی راہ دیکھ رہا تھا۔ امام غائب کے ظاہر ہونے پر دنیا کی بہت سی امیدوں کا دارومدار تھا وہ کرنئی عزت وہ بادشاہت جو آلِ فاطمہ کا حصہ تھی آخر انہیں ملنے والی تھی۔ بنی فاطمہ صدیوں سے مشرق میں سرگرداں تھے اور سر چھپانے کے لئے آسروں کی تلاش میں رہے تھے۔ بنو امیہ نے جب آلِ رسول اور بنو عباس پر دنیا تنگ کر دی تو بنو عباس نے امام جعفر صادق کے سامنے ایک خفیہ مجلس منعقد کی۔ جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ امیہ کے چنگل سے رہائی کے لئے کوئی نہ کوئی تجویز کی جائے۔ بات معقول تھی دل کو لگتی تھی مگر امام جعفر صادق نے ان سے اتفاق نہیں کیا۔ انہوں نے کہا خلافت اس پیلی قبا والے یعنی منصور کو ملے گی" حضرت کی پیشین گوئی آگے چل کر سچی ثابت ہوئی۔

عباسیوں کا تخت پر قبضہ کرنا بنو فاطمہ کے لئے ظلم و ستم کے باب کھولے ہوئے آیا۔ امام مستور رہتے تھے کیونکہ داعی کلمۃ الحق کو دار پر لٹکایا جاتا تھا۔ پھر مشرق وسطیٰ میں اپنے لئے انہوں نے ہوا کو ساز گار نہ دیکھ کر مغرب کا رخ کیا اور افریقہ بربریوں پر صدیوں حکومت کی۔ قاہرہ کو بسایا۔ جامع الازہر قائم کیا۔ اصل میں یہ سب اسماعیلی تھے جن کے نزدیک امام کا وجود ہر زمانے کے لئے ضروری سمجھا جاتا تھا۔ ان کے نزدیک اثنا عشریوں کا یہ عقیدہ کہ امام غائب ہیں اور لوگ اس کا انتظار کر رہے ہیں غلط تھا اگر امام غائب ہو جائے تو دنیا سے رشد و ہدایت کا سلسلہ ہی اٹھ جائے۔ پھر یونانی فلسفے اور ان کے تراجم نے عربی فارسی میں جگہ پا کر لوگوں کے خیالات کو بدلا تھا۔ عباسی خلفا کے عہد میں جہاں بغداد کا شہرہ دنیا کے بڑے بڑے درباروں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتا تھا وہیں پر سیاہ پوش بادشاہوں نے عجیب مذہبی تاویلیں اور احادیث سے اپنی مرضی کے مطالب اخذ کرنے شروع کر دیئے وہ قرآن کو خلق کہتے تھے اور لوگوں کے ایمان کو آزمائش میں ڈالتے تھے یہ معتزلہ تھے جو دربار پر قابض تھے اور علم درست بادشاہ کے دماغ کو پھیر دینے کا باعث بنے تھے۔ علما اس جور و ستم کے زمانے میں قتل کر دیئے گئے اور کلمہ حق کہنے کے جرم میں دار پر چڑھائے گئے۔ لوگ سچی بات کہتے ہوئے ڈرتے تھے۔ فرات کے کناروں پر پر شکوہ محلات میں رہنے والے اصل میں نہایت بے بس ہو گئے تھے۔ وہ علم و فضل کے

دلدادہ تھے مگر اس نئے نشتے کے لئے تیار نہ تھے۔ اس سارے خوب صورت بجروں سے بھرے دریا اور کنارے پر آباد بھرے پُرے شہر نے الف لیلےٰ کی داستانوں کو جنم دیا۔ محلات جن کی سیڑھیاں دریا میں اترتی تھیں اور زندگی اس گہما گہمی سے رواں تھی یوں لگتا ہے اسے کبھی موت نہیں آئے گی۔ چاندان سیاہ باغزل اور نغموں سے پُر شہر پر یونہی خاموشی سے چمکتا رہے گا یہ سرپشمی نے جاہ وحشم سے بے نیازی عطا کی تھی۔ مامون نے بنو فاطمہ کی مصیبتوں کی تلافی کرنا چاہی اور امام رضا کو اپنا ولیعہد بنانے کا اعلان کیا۔ ان کے لئے بیعت لینی شروع کی۔ اور سیاہ پوشی ترک کر کے سبز رنگ کو دربار کا رنگ بنا لیا۔ پھر امام رضا فوت ہو گئے کہنے والے کہتے ہیں مامون کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس نے انہیں زہر دے کر مروا دیا اور یوں ایک شجر بار آور ہونے سے پہلے ہی کاٹ دیا گیا وہ اپنے ساتھ ذرا سی امید بھی لیتے گئے۔ پھر خود بنو فاطمہ آپس میں عقائد کے اختلاف کی وجہ سے بٹ گئے وہ زہد و عبادات کی وجہ سے رسول کے رشتے کی وجہ سے محترم تھے۔ وہ اہل سنت کے نزدیک خلفا اور شیعہ عقیدے کی رو سے امام کہلاتے تھے۔ وہ شرف بارگاہ رسالت تھے اور سلطنت کے جائز وارث تھے۔

اسمٰعیل امام جعفر صادق کی اولاد تھے اور ان کی زندگی میں ہی فوت ہو گئے ان کی اولاد ول کا آسمان بھی دشمن تھا اس لئے ان کا پردوں میں پلنا ستر میں رہنا لوگوں سے کم ملنا اور اپنا پتہ نہ بتانا بہت ضروری تھا حسن بن صباح نے اپنی جنت بنائی۔ شیخ الجبل مشہور رہا فدائین کی فوج بنائی اور عقائد کی نئے سرے سے ترتیب دی۔ وہ مذہبی قیود سے آزاد امام تھا جس نے اپنے پیروؤں کو زندگی کی لذتوں خود فریبیوں اور مافوق الفطرت خوشبوؤں سے آشنا کیا۔ حکومت میں ظلم وستم روا رکھا اور "الموت" جیسے دار الحکومت میں بیٹھا رہا۔ اسرار کی ایک دنیا تھی جس میں کم تر درجہ فدائین کا تھا۔ جو قاتل ہوتے تھے۔ شیخ کے حکم سے سرتابی کی انہیں مجال نہ تھی۔ وہ بھرے مجمعوں میں لوگوں کو فنا کے گھاٹ اتار دیتے تھے۔ فری میسنز کی طرح مدارج تھے اور ہولے ہولے سارے ظاہری مناسک سے آزادی حاصل ہو جاتی تھی۔ مذہب صرف فدائین کو ظاہری ریاضتوں میں لگانے اور انہیں سارے مدارج طے کروانے کا نام تھا۔ ہر بات پوشیدہ رکھی جاتی تھی۔ مشرق میں ساری مذہبی تحریکیں فرقے در فرقے اہل بیت پاک کے نام سے موسوم ہوتے تھے۔ اللہ کا امر۔ قائم۔ امام مہدی اور مہدی موعود۔ مسیح آخر الزماں قیامت اور ایسے ہی لفظوں کے ہیر پھیر سے امام غائب کے

ظاہر ہونے کا سہارا لے کر لوگوں کے اس ایک راسخ عقیدے کے تحت سلطنتیں، جماعتیں نعرے وضع کئے جاتے رہے۔ جو لوگ ایک ہزار سال سے امام حسن عسکری کے پانچ سالہ بیٹے کا انتظار کر رہے تھے ان کے لئے یہ لمحہ فکر بھی تھا اور وجہ عید بھی۔

شیراز قافلوں کے ٹھٹھرنے پھولوں اور باغوں کی سرزمین

برقے از پردۂ لیلےٰ بدرخشید سحر،

ملا تقی نے ملا محمد سے کہا۔ "میں چاہتا ہوں تم اس مسافر کو اپنے گھر بلواؤ۔ مزید گفتگو سے بات سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ اس کے علاوہ میں کسی معتمد کو شیراز بھجوا رہا ہوں۔

"جی پدرِ محترم ملا محمد نے نہایت ادب سے سر کو جھکا کر کہا۔"

"ہمارے لئے یہ دوہری مشکل ہے کہ شیراز کے بعد اس کی گونج قزوین میں سنی گئی ہے" "یہ دعوت اگر اب سے پہلے عام ہو چکی ہوتی تو یہ شور و غوغا ہم تک پہنچ گیا ہوتا،" وہ بڑے دروازے کے قریب پہنچ چکے تھے۔ جہاں سے ایک راستہ ملا صالح کے گھر کی طرف جاتا تھا۔ جو چند دن پہلے سے صاحب فراش تھا۔ اور اس لئے آج کے اجتماع میں شریک نہیں تھا۔ ملا تقی بنا کچھ کہے اس طرف مڑ گیا اور ملا محمد سر جھکائے اپنے خیالوں میں مگن اپنے گھر کی طرف ہو لیا۔ پتہ نہیں ام سلمیٰ نے وہ آئینہ دیکھا بھی ہو یا نہیں؟

بچے برف کے گولے بنا کر ایک دوسرے پر مار اور کھیل رہے تھے۔ چھوٹے تختوں پر پھسلنے سے خوش ہوتے تھے۔ گلنار چہروں اور نیلی آنکھوں والے لڑکے سیاہ بالوں اور بڑے لبادوں میں لپٹی ہوئی گڑیوں کی طرح لڑکیاں بچپن کے دنوں کی گونج کو ملا محمد نے اپنے دل میں محسوس کیا۔ وہ یونہی ہنستے مسکراتے پُررونق چہروں کو دیکھ کر خوش ہو گیا۔ فکر سے آزاد سوچ کی پریشانیوں سے فلسفے اور اس کی پیچیدگیوں سے ناآشنا! کیا خدا آدمی کو ہمیشہ اتنا ہی معصوم اتنا ہی آزاد نہیں رکھ سکتا تھا! اس نے گھوڑے کی ڈھیلی راس کو ذرا سا جھٹکا دیا۔ باغوں سے گھرے بڑے بڑے دالانوں والے مکان میں بچے جاگ گئے ہوں گے۔ خوب روشن شعلوں والی آگ برف سے بھرا حوض، درختوں کی سفیدی کے بوجھ سے جھکی ہوئی شاخیں اور پھر نہایت بے چین روح لئے خاموش خاموش اس کی بیوی جس سے نہایت تعلق خاطر ہونے کے باوجود وہ یگانگت نہیں پاتا تھا جو مفاہمت تو کہلا سکتی ہے محبت نہیں۔ اس نے بے نام سا ایک خوف اسے دیکھ کر ہمیشہ محسوس کیا تھا۔ جیسے اس کی شفاف جلد کے نیچے غصے اور جنون کی لہریں سی رواں ہوں۔ آہستہ آہستہ لرزتی ہوئی نازک اندام لڑکی جو ازدواجی زندگی میں کبھی اپنی

دوشیزگی بھول نہیں پاتی۔ اس نے کشف کی طرح یہ جان لیا تھا کہ وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ جانے کس اشارے کی منتظر ہے۔ وہ ہمیشہ کہیں اور رہتی۔ نہایت عمیق خلوتوں میں اس کی روح کبھی اُس سے ہمکلام نہیں ہوئی جیسے وہ خفا ہو پتہ نہیں کس سے! وہ پرے دور چیزوں سے پار دیکھتی تھی ایک ایسی مخلوق کی طرح جس کی ہستی کی جڑیں کسی اور سرزمین میں ہوں۔ بچوں کے ساتھ اس کا رویہ نہایت مشفقانہ تھا جیسے اس نے اپنے آپ کو ان میں غرق کر لیا ہو مگر لگتا تھا وہی اس کا مقصدِ حیات نہ تھے وہ اس کے چچا کی بیٹی تھی بچپن سے انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ مگر پھر وہ اُس اجنبیت کی دیوار کو پھلانگ نہ سکا تھا جو یا تو آدمی پار کر جاتا ہے یا پھر کبھی نہیں۔ وہ دو اندھیروں کی طرح ایک دوسرے کے مقابل تھے۔ ان کے اندر گرجتے ہوئے طوفان تھے۔ نہیں صرف وہ اپنے ناتواں وجود میں طوفان چھپائے تھی اور ملا محمد شاید ان کی آمد سے باخبر تھا۔ وہ اس کے لئے بیک وقت مقدس بھی تھی اور کبھی کبھار اس کا جی چاہا کرتا تھا وہ اسے مسل دے توڑ دے فنا کر دے۔ دیوانہ ہو کر اس کے تار و پود بکھیرے۔ یہاں تک کہ وہ اس کا دل ہاتھ میں لے سکے دیکھ سکے کہ ان غزالیں آنکھوں کی سرد مہری کی وجہ کیا ہے؟

ملا محمد نے اپنا سر جھٹکا تیرہ سال کے عرصے میں وہ کسی جگہ نہیں پہنچے تھے یہ سفر نہیں تھا آگے کی طرف بڑھنا نہیں تھا۔ وہ تحت الثریٰ میں گر رہا تھا۔ ہاں وہ اندھیرے میں تیر کی سی اڑان سے گرتا چلا گیا تھا۔ اس پر بد روحوں کا سایہ نہیں تھا مگر وہ کھلی آنکھوں سے اپنے سامنے دیکھتی رہتی تھی۔ جیسے کسی بادشاہ کے حضور حاضر ہو۔ ایسے وقفوں کے بعد وہ اٹھتی اور اشعار رواں ہوتے جیسے ماورائی طاقتیں اس پر بار ہو رہی ہوں۔ وہ شعر کہنے پر مجبور کر دی گئی ہو۔ کیا اس کی شاعری الہامی تھی؟ اس پر شعر اترتے تھے۔ کوئی محبوب تھا جو اسے تڑپاتا تھا وہ تو غیر مرئی طاقتوں کے ہاتھ میں گوئے بازی کی گیند تھی کہ کھنچی جاتی تھی لپٹائی جاتی تھی

"میں خفا ہونے میں حق سے کام نہیں لے رہا۔ ملا محمد نے اپنے آپ سے کہا۔ زندگی بہر حال ہر طور گزر جاتی ہے۔ ایران کی شان و شوکت وہ نہیں رہی جو صدیوں پہلے تھی۔ ہنخامنشی آج زیرِ خاک سوئے ہوئے ہیں جانے کہاں کہاں! زرتشت اپنے آتشکدہ دل سمیت رخصت ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ اور ہم بھی چلے جائیں گے ہاں جانا ہی ہو گا۔

ایک بڑی بھیڑ اس کے گھر کے باہر منتظر تھی موجود۔ آقا اس کے ایک خادم نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "لوگ ایک فتنے کی خبر لائے ہیں شہر میں سخت اضطراب ہے"

وہ گھوڑے سے اترا اور لمبے کوٹ کو اپنے گرد لپیٹ لیا۔ یکایک تیز ہوا چلنے لگی تھی جو شمالی برف سے ڈھکے پہاڑوں کی یخ بستگی اپنے ساتھ لائی تھی۔ لوگوں نے ایک طرف ہٹ کر راستہ بنایا اور پھر دیوان خانے کی طرف اس کے پیچھے سر جھکائے چلنے لگے ان میں سے بہتوں کے لباس بوسیدہ اور نہایت گھسے ہوئے تھے جو نہ ٹھنڈ روک سکتے تھے اور نہ ہی گرمی دے سکتے تھے مگر وہ بہت بے چین دکھائی پڑتے تھے اور اس لئے یخ ہوا سے بے پرواہ تھے۔ وہ سب اس کے منہ سے کچھ سننے کے لئے چپ ہو گئے۔

آقائے بزرگ نے فرمایا ہے کہ میں اس مسافر سے مجلس کروں اور معلوم کروں مگر تم اس سے پہلے ہی چلے آئے ہو۔ معلوم ہوتا ہے ایک سے زیادہ لوگ اس بات سے آشنا ہیں۔

ہاں آقا بیشک آقا۔ لوگوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

"وہ مسافر کہاں ہے؟" ملا محمد نے سوال کیا۔

"جمعہ کی نماز کے بعد غائب ہو گیا" لوگوں نے پھر کہا۔

کیا شہر میں اور کسی جگہ بھی یہ خبر آئی ہے یا وہی ایک مسافر تھا جو خبر دے کر غائب ہو گیا۔

"جی آقا" ایک کاروان شیراز سے آیا ہے اور سرائے میں ٹھہرا ہے۔ وہ لوگ تو اسے دیوانے کی بڑ سمجھتے ہیں اور ہنس رہے تھے۔ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ خدا اپنی نشانیوں کے ساتھ امام غائب کو صرف مدینے میں بھیجے گا۔ یہ شیرازی "باب" فساد خیالات کا مریض ہے۔ آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ امام غائب مدینے سے اتنی دور ہوں۔"

میرا بھی یہی خیال ہے۔ زیادہ مضطرب ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ ایک بے پر کی خبر ہو گی جو کسی سرائے میں حشیش پینے والوں نے یونہی کہہ دی ہو گی۔ "بلالی" تم ذرا سرائے تک جاؤ اور معلوم کرو کہ معاملہ کیا ہے۔ ان میں سے میر کاروان کو ہمارا سلام کہو اور اپنے ساتھ لاؤ۔ آقائے بزرگ شام سے پہلے اس سلسلے میں قطعی بات سننا پسند کریں گے" خادم سے کہہ کر وہ مڑا۔ دیوان خانے کے دالان کے باہر ہوا تیز ہو گئی تھی اور سنگ مرمر کے فرش پر اڑ کر آتی ہوئی برف لہریا ریت اور غبار کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ لوگ مطمئن ہو کر لوٹنے لگے وہ لمبے صوفے پر اکیلا بیٹھا تھا اور روشن آگ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شعلے لپک رہے تھے۔ جیسے سمندر کی موجیں سرشاری سے اٹھتی ہیں اور واپس جاتی ہیں۔ کھڑکیوں کے باہر قریب کے درختوں کی شاخیں تیزی سے ہوا کے ساتھ جھک کر دروازوں پر یوں دستک دیتیں۔ جیسے اذنِ باریابی چاہتی ہوں۔ خادم نے قہوے کا فنجان لا کر سامنے رکھ دیا

الماریوں میں کتابوں کے سنہری لکھے نام آگ کی لپک کے ساتھ روشن ہوتے اور مدھم پڑ رہے تھے یہ کتابیں جن کے مضامین پر جانے کتنے زمانوں صومعہ نشینوں نے دنیا کی نعمتوں سے منہ موڑا، گوشہ نشین ہو کر عرق ریزی کی تھی۔ سوچ بچار۔ مراقبے۔ عبادات۔ جسم و جان کو گھلایا پایا تھا۔ وہ بہر حال ان کتابوں کے صفحوں میں اب بھی زندہ تھے اور ان میں اتنا جلال تھا کہ اپنی خاموش صحبت سے زندوں کے دلوں پر دماغوں پر قبضہ کئے ہوئے تھے۔ یہ علم کا جلال تھا یہ خرد کی جنون کے ساتھ صحبت کا نتیجہ تھا۔ جنون جو فاصلوں سے بھی آدمی کی زندگی پر اختیار رکھتا ہے۔

کتنے ایسے بیش بہا خزانے برباد ہوئے تھے۔ دشمن سیلاب عظیم کی طرح سے نکلے اور انہوں نے آبادیوں کو ویرانوں میں بدل دیا۔ تاتاری پہاڑی راستوں پر اپنی کھڑکھڑاتی ہوئی گاڑیوں پر خیمے اور ضروریات زندگی بار کئے ہوئے اپنے شامانوں کے کہنے کے مطابق مشرق سے مغرب پر حملہ آور ہوئے تھے۔ منگول سلطنت چین میں قبلائی خاں کے زور بخت کا نتیجہ تھی۔ خیل زریں قپچاق روس میں تھے۔ برقائی اور اس کی اولادیں شمال میں تھیں۔ ایلخانی سلطنت ایران میں تھی۔ چنگیز خاں نے اپنے ہم وطنوں کے لئے شہروں کو برباد کر کے بیخ و بن سے اکھیڑ کر دشت بنائے تھے کہ آزاد رہنے والے قبیلے گھبرا کر واپس لوٹنے کی نہ سوچیں۔ مسلمانوں نے چھ صدیوں میں علم و فضل کے جو بیش بہا خزانے اکٹھے کئے تھے۔ وہ سب چنگیز اور اس کے جانشینوں کی ترکتازی سے تباہ ہو گئے خون کی ایک لمبی ندی ان کی گذرگاہ کا نشان بتاتی تھی۔ انہوں نے جاودانی آسمان کے لئے زمین کی نحوست سے بچنے کے لئے انسانوں اور گھوڑوں کی قربانیوں کے ساتھ ساتھ تہذیب و تمدن کی قربانیاں دیں۔ ایک سیل بے پناہ تھا جس کے سامنے کوئی شے ٹھہر نہ سکی۔ چراگاہوں اور سارا سال بہتے پانیوں کی تلاش میں وہ کہاں سے کہاں نکل آئے تھے۔ دنیا میں چاروں طرف پھیلی ہوئی ایک وسیع مملکت بنا کر چنگیز خاں جاودانی آسمان کے حکم سے یاک کے نو دموں والے پرچم تلے آرام کرنے لگا۔ پھر جیسا کہ دستور جہاں ہے۔ اس کے جانشینوں نے اپنے لئے آرام دہ محل بنوائے یورتوں میں رہنے اور گھوڑیوں کا دودھ پینے والے بدھ مت کے پیرو نسطوری عیسائی اور مسلمان ہو گئے اور دنیا کی تہذیبوں کی نگرانی کا کام ان کے سپرد ہوا۔ دولت ہاتھ بدلتی ہے۔ کعبے کو صنم خانے سے پاسبان مل گئے۔ زمانوں نے اپنے خواب وہیں سے جوڑ لئے جہاں سے وہ ٹوٹے تھے۔ مگر سمرقند و بغداد کی وہ رونقیں واپس نہ آئیں۔ نام وہی رہے مگر شان و شوکت جن کے فسانے خواب لگتے ہیں پھر نہ پلٹی پرانے شہر آباد ہوئے مگر طاقت کا عصا خانہ بدوشوں کے ہاتھوں سے نکل

کر متمدن ہاتھ میں منتقل ہوگیا۔ ہلاکو خاں نے ایران میں جن چیزوں کو تاخت و تاراج کرنا چاہا تھا اس کے ایلخانی جانشین اس تمدن کی پرانی میراث کے محافظ بنے۔ موسیقی، مصوری (جو اصلاً چینی تھی) اور شاعری دشت کو گلزار بنانے کے لئے ترقی باغوں کا رواج اور حافظ شیرازی کی غزل:-

دورِ گردوں گرد روزے بر مراد ما نگشت
دائما یکساں نہ ماند کارِ دوراں غم مخور

ملا محمد نے سوچا کتابوں سے عشق اور موسیقی سے لگاؤ تو ناقابلِ شکست تھا۔ یہ ایرانی سرشت بھی جو ام سلمیٰ کو جانے کن نسلوں سے ورثے میں ملی تھی ان سب کی رگوں میں جانے کون کون خون تھا؟ ہر قطرے کی اپنی پکار تھی اور ہر پکار کا جواب آدمی کو دینا ہی پڑتا تھا۔ اپنے خون کی امانتوں سے کوئی بھاگ کر کہاں جا سکتا ہے!

پتہ نہیں وہ سب کون تھے کہاں سے آئے تھے؟

اپنے شجروں کی حفاظت کے باوجود نجفِ اشرف کی تعلیم کے باوجود وہ کیا جان سکتے تھے کہ نسلے خون کی خاصیت کیا ہوتی ہے؟ اس کا ارث تو یہی تھا کہ وہ ملاتقی کا بیٹا اور باپ کے بعد ملا مجہتد بننے والا تھا۔ وہ امام غائب کا انتظار کر رہے تھے اور اب یہ "باب" کا فتنہ اٹھا تھا۔ پتہ نہیں "باب" کون تھا اپنے طور پر وہ بہت روادار تھا اور سمجھتا تھا کہ ہر شخص کو تھوڑی سی دیوانگی کا حق پہنچتا ہے اگر آدمی کبھی کبھار سمجھ بیٹھے کہ وہ ہر شے پر قادر ہے تو سوچ لے آخر اس سے کسی کا کیا جاتا ہے۔ اس نے عجیب عجیب فلسفے پڑھے تھے اور وہ ہر مذہب کو جینے کا حق دینا چاہتا تھا۔ اگر شریعت موسوی والے حضرت عیسےٰ کو نہیں مانتے تو کیا ہے؟ جب تک وہ زندگی کے دوسرے ارکان پر یقین رکھتے ہیں ان کو لوگوں سے اپنے کو بچانے اور سنبھال کر رکھنے اور دوسروں کے حقوق غصب کرنے کا لالچ نہیں سب ٹھیک ہے۔ اس کے خیالات اگر اس کا پدرِ محترم پڑھ سکے تو اسے زندان میں ڈال دے۔ وہ ام سلمیٰ سے یہ باتیں نہیں کر سکتا تھا اس کی طبیعت میں بے چینی تھی۔ علم کو سہارنے کی طاقت نہ تھی۔ وہ اپنے خیالات میں آزاد تھی۔ وہ آزادی کا قائل تھا مگر نہ اس حد تک علم جب اندر اترتا ہے تو آدمی بہت عاجزی محسوس کرتا ہے۔ مگر ام سلمیٰ ایک جلتا ہوا شعلہ تھی۔ ان دونوں کا ساتھ کب سے تھا شاید چل جائے۔ زندگی کی گاڑی چلتی رہے۔

مشرق و مغرب کے خیالات نے ملا محمد پر ایک عجیب اثر کیا تھا۔ وہ اندر سے کسی بھی مذہب کا بھی قائل نہ رہا تھا۔ مسلمانوں میں ایک شدتِ احساس اور جنون تھا جو کبھی کبھار انتہا کو پہنچا۔ صلیبی جنگیں جن کا نتیجہ کچھ نہ نکلا تھا۔ ایسی ہی جنون کی داستانیں تھیں۔ جن میں اسلام کی سی زندگی نہ تھی اور نہ سرفروشی کے ولولے ساتھ وہ میانہ روی۔ اس لئے صلیبی جنگیں لٹیروں کی یلغاریں تھیں۔ یورپ ایشیا کے دروازوں پر دستک دیتا رہا۔ باہر کے ایوانوں میں دندناتا رہا اور بالآخر واپس چلا گیا۔ تہذیبوں پر یورشیں وہ بڑی بڑی لہریں تھیں جو سب کچھ بہا کر لے گئیں اور جس طرح طوفان کے تھم جانے کے بعد بچ جانے والے ڈھونڈ ڈھانڈ کر آسرے کھڑے کرتے اور جینا سیکھ لیتے ہیں ذرا بدلی ہوئی صورت میں لوگوں نے زندگی بسر کرنا شروع کر دی۔ سوچ بچار کی دولت جو رہ جاتی ہے باقی سب فنا ہے فنا زمین اپنے بچوں کے اندر اپنے طوفانوں کے اندر اپنے ممکنات کی خود حفاظت کرتی ہے۔ یہ جاودانی آسمان کا اٹل قانون ہے۔

خادم سرائے سے واپس آئے تھے۔ سالارِ کارواں ایک نوجوان تھا۔ ملا محمد نے اس سے بڑی محبت سے مصافحہ کیا۔ وہ اپنے پاٹے تابے وہیں دہلیز پر اتار آیا تھا۔ برف سے سفید بڑے کوٹ کو "بلالی" ملا محمد کے خادم نے باہر ہی لٹکا دیا تھا خوب روشن کمرے میں وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے اور آگ کی گرمی کو بڑی طمانیت سے دیکھ رہے تھے۔

شیراز کا موسم کیسا تھا۔ ملا محمد نے پوچھا۔

نوجوان نے شعلوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا "بہت برا"۔

"کیوں شیراز تم تو اس موسم میں بھی پھولوں اور خوشبوؤں سے بھرا ہوتا ہے۔ میں اکثر وہاں گیا ہوں" ملا محمد نے کہا۔ ہنس کر نوجوان نے کہا۔ "جب تازہ فتنے کا چرچا خوب ہو۔ قائم آلِ محمد کا ظہور جو ہونے والا تھا۔ دیوانوں نے اس کا اعلان کر دیا ہو تو آپ موسم کو کیا کہیں گے۔"

ملا نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

"اور پھر نوجوان سالار نے کہا اس کے ماننے والے ایسے ثقہ لوگ ہیں جن پر یقین ہے کہ وہ غلطی نہیں کر سکتے۔" "تم کیا کہتے ہو۔ اپنی بات کہو تم اسے فتنہ کہتے ہو یا سچائی" ملا محمد کے سوال نے اسے گھبرا دیا۔

"میں" مسکرا کر نوجوان سالار نے گردن کو جھکایا۔ "میری رائے کیا اہمیت رکھتی ہے۔ میں مسافر آدمی ہوں۔ آج یہاں اور کل وہاں۔ قافلوں کے پرانے راستوں پر گرد اڑتی رہتی ہے۔

آندھیاں نشانوں کو مٹا دیتی ہیں۔ یہ مذہب کے الجھے ہوئے تاگے ہیں انہیں الگ کرنا آپ لوگوں کو مبارک ہو"

"تم نے اسے دیکھا تو ہوگا نا! میرا مطلب ہے وہ جس نے "باب" ہونے کا دعویٰ کیا ہے" ملا محمد نے پوچھا۔ شیراز کی ہوا نے اسے بہکا دیا ہوگا۔ کبھی کبھار یہ ہوا آدمی کو دیوانہ بھی بنا دیتی ہے ورنہ جس علی محمد کو ہم نے "باب" کا دعویٰ کرتے سنا ہے وہ تو ایک عطار کا لڑکا ہے۔ عبادات اور مناجاتوں میں لگا رہنے والا نہایت ہی کم گو۔ پتہ نہیں اس نے یہ بات کیوں کہی ہے۔ اس لئے کہ ہم نے تو اسے کبھی فضول گفتگو کرتے نہیں دیکھا۔ اب بھی یہ امر پوشیدہ ہے وہ کسی سے کھل کر کچھ نہیں کہتا ہو سکتا ہے یہ فتنہ اسے ذلیل کرنے کے لئے اس کے دشمنوں نے شروع کیا ہو اور اس کا نام لے دیا ہو۔ وہ دونوں چپ ہو گئے۔ ملا محمد نے بلالی کو بلایا۔ "ان کے لئے قہوہ لاؤ"

"نہیں آقا اب میں اجازت چاہوں گا" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

ملا محمد نے کہا "اتنی دور آکر یونہی چلے جانا اچھا نہیں لگتا۔ اور پھر روسی قہوہ خوشبو اور ذائقے میں مختلف ہوتا ہے۔ زبان پر ذرا سا کڑوا پھر حلق کے اندر اتر کر تیز اور رگوں میں گرم۔ اب کے زمستانی ہوا پہلے چلنے لگی ہے۔ برف بھی بہت پہلے پڑی ہے۔ قافلوں کے راستے دشوار ہو گئے ہوں گے"

حسین صادق ہنسا اور بیٹھ گیا اس کے دانت نہایت خوبصورت تھے اور مسکراہٹ میں اتنی طمانیت تھی گویا وہ اپنے گھر میں ہو۔ ملا محمد نے محسوس کیا کہ وہ بہت حیرت سے ان کتابوں کی طرف دیکھ رہا ہے جو اس کے پاس ہی لکڑی کی تپائی پر رکھی تھیں۔ قافلوں کے سالار عجیب قسم کے سوداگر لوگ ہوا کرتے تھے یا پھر سعدی کی حکایات سنانے اور حافظ شیرازی کی غزلیں گانے والے جن کے طنبورے سامان کے ساتھ اونٹوں پر ہوتے۔ جب قافلہ ٹھہرتا تو ان میں سے کوئی جس کی آواز اچھی ہوتی الاؤ کے پاس بیٹھ کر شراب و شعر کے اپنے پسندیدہ اشعار گاتا۔ یہ ہجر و وصال کی داستانیں تھیں جو ماہتاب کے عروج کے ساتھ صحرا کی فضا میں کرنوں کی طرح بکھرتیں۔ آدمی اور اس کے خوابوں کی کہانیاں، لمبی نامرادی، دوری اور دل شکستگی کے قصے۔ ایسے محبوب کی محبت جو پاس نہ آئے نہ لگاؤ کا جواب دے۔ جو بادشاہ کی طرح صرف اطاعت چاہے۔ یہ سدا سفر میں رہنے والے جو صبح و مسا چلنے والی ہوا کی طرح شہروں اور دیہاتوں کے قریب سے گزرتے رہتے حدی خوان جو اونٹوں کی لمبی قطاروں کے ساتھ ٹیلوں اور شاہراہوں پر نمودار ہوتے۔ منزل کی طرف رواں دواں۔ اور پھر بھی جن کا کسی شہر میں آنا تھوڑی سی ہلچل کا باعث ہوتا۔ لوگ جن کا انتظار کرتے تھے۔

"یہ شیخ احمد احسائی کی کتابیں ہیں" ملا محمد نے اسے بار بار ادھر ہی دیکھتے پا کر کہا۔ حسین صادق نے اپنا سر ذرا سا خم کیا۔

"آپ شیخ کے نام سے تو واقف ہی ہوں گے" ملا محمد نے اپنے قہوے کا فنجان اٹھایا جس کو بلالی نے پھر سے بھر دیا تھا۔

یزد میں اکثر میرا گذر ہوا ہے۔ میں شیخ کے شاگردوں سے ملا ہوں۔ ان کا فلسفہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ سید کاظم رشتی بھی الجھے ہوئے ہیں۔ ہم لوگ تو یوں بھی مسافر آدمی ہیں۔ اس نے ہنس کر قہوے کا بڑا سا گھونٹ بھرا۔ ملا محمد ذرا سا چونکا۔ حسین صادق اس کے اندازے کے مطابق ذہین، ہوشیار، محتاط اور خواندہ آدمی تھا۔ اس کی نشست و برخاست میں نفاست تھی۔ جو اچھی تربیت، عمدہ صحبت اور سلجھے ہوئے ہونے کی نشانی ہے۔ اس نے احمد احسائی والی کتاب کو احتیاط سے اٹھانے سے پہلے قہوے کا فنجان نیچے رکھ دیا اور اس کی طرف دیکھ کر کہا، اجازت ہو تو میں اسے دیکھ لوں"۔

"بسم اللہ کیجئے" ملا محمد نے کہا۔

حسین صادق نے کتاب کے ورق نہایت تکلف سے پلٹے۔ یہ ایک قلمی نسخہ تھا جس کے حواشی نہایت باریک قلم سے لکھے گئے تھے اور سنہرے حروف کے گرد بیل بوٹے بنے تھے گویا پھولوں سے بھری بیلیں لپٹی ہوئی تھیں۔ یہ ان کے درس میں شریک کسی شاگرد نے ترتیب دیا تھا۔ ان کے فرمودات کو نہایت سلیقے سے جمع کر کے ان پر عنوانات قائم کئے تھے۔ یہ شیخیہ فرقے کے سارے اعتقادات اور خیالات کا گویا نچوڑ تھا۔

"آپ شیخ کی اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اب ظہورِ قائم کا وقت آ گیا ہے"، حسین صادق نے پوچھا۔ ملا محمد نے بہت بے چینی سے اپنی جگہ پہلو بدلا۔ "جب تک مجتہد الدولہ نجف اشرف میں ہیں کچھ نہ کہیں ہم کیا کہہ سکتے ہیں" بات کرتے ہوئے اس کے ذہن میں اپنا باپ ملا تقی اور چچا ملا صالح تھے۔ "درست"، حسین صادق نے کہا۔ آپ نے شروع میں ہی مجھ سے پوچھا تھا کہ میں کیا سمجھتا ہوں۔ میں یہ کہوں گا کہ قائم کا آخر ہزار سال تک راہ دیکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ خدا اور رسول اور قرآن کیا کافی نہیں ہیں؟ آئمہ اطہار کا وجود خود رشد و ہدایت ہے۔ وہ دم لینے کو رکا۔ ملا محمد نے کہا "میں ہمہ تن گوش ہوں"۔

"میں ساحلِ سمندر کے ساتھ ساتھ اندرونِ ملک سفر کرتا رہتا ہوں۔ یوں ہے کہ تنہا ہونے

کے باوجود ہم لوگ بہت دنیا دیکھتے ہیں۔ کئی قسم کی آب و ہوا اور کئی طرح کی نئی نئی شورشیں جو کبھی کبھار برحق ہوتی ہیں اور کبھی کبھار محض پریشان کن جو مفاد پرست لوگ اپنے طور پر فائدہ اٹھانے کے لئے بپا کرتے ہیں۔ جب سارا ملک آتش فشاں کے دھانے پر کھڑا ہو تو بے چینی کا ہونا یقینی ہے اس اضطراب کو کچھ لوگ اپنے لئے استعمال کرتے ہیں۔"

ملا محمد نے پردہ اٹھا کر باہر جھانکا۔ کربلا کی حقیقت کیا ہے؟" اس کے جی نے اس سے پوچھا۔ ایک مسلسل بین کرنے اور رونے کی آواز ہے جو دشت وصحرا میں شہر اور جنگل پر چھائی رہتی ہے۔ خون ناحق کے لئے دادرسی کی صدا۔ ایران کے اوپر وہ ایک دھند بن کر پھیلی ہے صفوی بادشاہ بھی تو اس کی شدت کو کم نہ کر سکے۔ وہ آواز ہمیشہ دنیا سے جور وستم کا خاتمہ کرنے کا تقاضا کرتی رہتی ہے۔ خون شہیداں جس کی سرخی کم نہیں ہوئی اس لئے کہ اس قطب شمالی سے قطب جنوبی تک پھیلی ہوئی برفانی طوفانوں سے برستی بارشوں اور جس کے دل آزار خطوں تک کہیں نہ کہیں مظلوم ظلم کا نشانہ بنتے ہیں اور ان کا خون اس پاک رود احمریں میں مل جاتا ہے جس کا منبع فرات کے کناروں پر شاہ شہیداں کا خون ہے!

تمہارا خیال ہے "باب" کا فتنہ بھی ایسا ہی ہے؟ اس نے حسین صادق سے پوچھا۔

علی محمد جوان آدمی ہے اپنی عبادات میں شدید سے شدید تر ریاضت کو پسند کرتا ہے کاظم رشتی کے درس میں شریک رہا ہے۔ سخت مراقبے شاید اس کے ذہن پر اثر انداز ہو گئے ہیں۔ لوگوں کو افکار جہاں سے بچنے کے لئے کوئی بار گراں اٹھانے کو دے دیا جائے تو وہ اسے دھکیل کر پہاڑ کی بلندیوں تک لے جائیں گے۔ پھر وہ لڑھکے گا تو پھر اسے واپس چوٹی تک پہنچائیں گے۔ ہمارے ہاں جو صورت حال ہے اس پر کچھ نہ کچھ ہونا تو لازم تھا اور اگر وہ یہ کہتا ہے کہ وہ دروازہ ہے تو اس میں کیا قباحت ہے۔ آخرت پر جانے اور کتنے دروازے کھلے اور کتنے ابھی کھلنے والے ہیں۔ شیخ احمد احسائی نے بھی تو یہی کہا ہے کہ روح جی اٹھے گی واپس آئے گی جسم نہیں اور اگر امام آئیں گے تو اب خاکی جسم سے نہیں۔ انہیں بہر حال کسی جسم کا سہارا لینا پڑے گا اور جسم زمین سے نہیں اگتے، پیدا ہوتے ہیں۔ جس طرح موسیٰؑ پیدا ہوئے عیسیٰؑ پیدا ہوئے اور رسول خداؐ پیدا ہوئے۔ ملا محمد بہت غور سے حسین صادق کی طرف دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا یہ شیخ کے فلسفے سے واقف معلوم ہوتا ہے۔ پڑھا لکھا ہے ایسے میں جب کہ مجتہدین اور امراء کے طبقے میں تعلیم ہے۔ یہ پتہ نہیں کس خاندان کا فرد ہے مگر اس کے پدر محترم کے سوال کا جواب بھی تو دینا ہے۔

"شیخ احمد احسائی نے لکھا ہے کہ مدعی حق میں چار صفتوں کا ہونا ضروری ہے" حسین صادق نے کتاب کھول کر پڑھنا شروع کیا۔

۱ :۔ ادعا در خور زمان نماید۔

۲ :۔ اتبی داشتہ باشد۔

۳ :۔ آیت او مناسب ادعائش بودہ باشد۔

۴ :۔ آیت خود را مقارن ادعا ظاہر نماید۔

اور وہ چار طرح سے ظاہر ہوگا :۔

۱ ۔ لسانِ آیات ۲ ۔ لسانِ مناجات

۳ ۔ لسان خطیب ۴ ۔ لسان زیارات و تفاسیر آیات ، آئمہ تطہیر

اس نے کتاب بند کر کے رکھ دی اور فنجان کو روشنی کے مقابل کیا۔ قہوہ رکھے رکھے گاڑھا ہو گیا ہو گا۔

" بلالی " ملا محمد نے کہا " قہوہ "

نہیں آقا یہ روسی قہوہ میرے حلق سے نہیں اتر سکتا۔ اس کا مزہ میرے مزاج کے مطابق نہیں۔ ملا محمد اپنے سارے رکھ رکھاؤ اور سنجیدگی کے باوجود ہنسا۔

میں نے کہا تھا روسی قہوہ آپ کو پسند نہیں آئے گا۔ یہ ہم جنوبی لوگوں کو بالکل پسند نہیں آتا اس میں نہ خوشبو ہوتی ہے اور نہ ہی ذائقہ۔ یہ تو قازقوں اور ترکوں کے پینے کی شے ہے۔ خانہ بدوش قبیلے ناچ کی دھن بجاتے ہوئے اسے پیتے ہیں۔ ہماری تہذیب جوان میں سب سے پرانی ہے۔ ہم ان چیزوں کو کب پسند کر سکتے ہیں۔ یہ احساس برتری سب سے الگ ہونے کا اونچے ہونے کا خیال تو ہم کو طوفانوں میں سے نکال کر لایا ہے "حسین صادق نے کہا۔

ملا محمد نے کہا " یہ احساس برتری نہیں ہے حقیقت ہے۔ دنیا کی چند بڑی بڑی تہذیبوں میں سے ہم ہیں۔ ایران نے ہمیشہ باہر سے آنے والوں کو برداشت کیا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ہم میں مل گئے ہیں۔ ایک ہو گئے ہیں۔ ہمارے ماضی نے انہیں اپنے میں جگہ دے کر اپنا حصہ بنا لیا ہے۔"

" آپ کا خیال ہی خیال ہے " حسین صادق نے کہا منگول فتنے نے کچھ چھوڑا تھا۔ جس کو ہم اپنا کہہ سکتے۔ چنگیز اور اس کا بیٹا او غدائی۔ منگو خاں اور ہلاکو۔ پھر تیمور کتنے نام ہیں جو خونیں آندھی بن کر ہم پر سے گزرے۔ ہم تو ان کی گرد راہ ہیں آقا۔ کاروانوں کی بجھی ہوئی آگ اور

ٹوٹی ہوئی طنابیں بتاتی ہیں کہ یہاں گذرگاہوں کے آس پاس کچھ باقی ہی نہیں رہا تھا اور ہماری رگوں میں جانے کون کون خون ہیں۔"

"ہوسکتا ہے ممکن ہے تمہارا خیال ہی قابلِ غور ہے" ملا محمد نے پردہ کھول دیا۔ باہر ایک تصور سے بھی حسین شام بڑھی آتی تھی۔ برف پھر تیزی سے گرنا شروع ہوگئی تھی۔ روئی کے گالوں کی بارش ہو رہی تھی۔ بچے کھلکھلا رہے تھے دوڑ رہے تھے ہنس رہے تھے۔ چار دیواری کے باہر ان کی آوازیں زندگی سے بھرپور خوش اور تازہ تھیں۔ اگرچہ کائنات کب سے ہے نہایت پرانی تو پھر کیا ہے یہ گھڑی جو گزر جاتی ہے ان ساری صدیوں کے ساتھ ملتی جا رہی ہے جو کبھی تھیں۔ وقت کے اس لمحے میں زندہ رہنا ہونا اور پھر بھی ان سارے فراموش کردہ زمانوں کا حصہ بنتے جانا جیسے پانی کا قطرہ سمندر میں ملنے کے لئے سفر پر رواں رہے اس لئے اگر وہ باب۔۔۔ اپنے آپ کو خدا بھی کہے تو کیا ہے۔ مذہب ایک ذاتی یقین ہے۔" پھر فوراً اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا کہیں اس کے چچا اور باب نے اس کے خیالوں کی چاپ نہ سن لی ہو۔ یہ سارے فتنے خارجی ہیں۔ جن کا دل سے کوئی تعلق نہیں۔ اقصائے عالم میں جانے کیسے کیسے مذہب رہے ہوں گے۔ لوگوں نے کیسے کیسے یقین رکھے ہوں گے۔ کیسی کیسی چیزوں کو پوجا ہوگا کبھی اپنے کو اور کبھی دوسروں کو خدا سمجھا ہوگا۔ پھر وہ کیا ہے کون ہے جو ان سب پکاروں کے جواب میں پکارتا ہے۔ بولتا ہے۔ قریب رہتا ہے۔ انسان کو بناتا ہے۔ گو دیسے گور یک اس کی حفاظت کرتا ہے، اگر وہ صرف خالص طریقوں سے کہی ہوئی دعائیں قبول کرتا تو آگ کو پوجنے والوں" اور تا" پڑھنے والوں کی دعائیں کیوں سنتا۔ پتہ نہیں اس نے اپنے سر کو زور سے جھٹکا۔ راستے کونسے ہیں۔ آدمی کی اپنی طاقت کیا ہے؟

حسین صادق نے اسے دریچے کے سامنے کھڑے سر کو جھٹکتے دیکھ کر تعجب کیا۔ پھر اس نے خیال کیا کہ اب چل ہی دینا چاہئے۔ اونٹوں کو ذرا محفوظ جگہ پر ذرا اوٹ میں کھڑا کرنا ہوگا اور اس کے ساتھی منتظر ہوں گے۔ مجتہد کے پیغام کو وہ دوستانہ تو نہیں سمجھے۔ یہ اور بات ہے کہ ملا محمد اپنی ذات سے بیحد شریف بے ضرر، بہت متواضع اور ضرورت سے زیادہ خاموش طبع تھا اندر سے الجھا ہوا اور باب کے فتنے سے سربسر بے خبر۔

باہر باغ میں درختوں کی ڈالیاں سفید ہوگئی تھیں۔ روشوں پر سخت برف کی سطح ڈھکی ہوئی تھی اور چلنے میں جب نرم برف میں پاؤں دھنستے تو وہ جمی ہوئی برف پر پہنچتے اور پھسلتے۔ سحر کے

زور سے جیسے حسن بن صباح کی جنت ہو۔ یہ بر فانی دنیا جو چند دنوں سے عالم وجود میں آئی تھی پرنور دھلی دھلائی اور ناقابل یقین حد تک نئی لگتی تھی۔ حسین صادق نے "بلالی" سے کہا کہ اسے سرائے تک جانے اور تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں وہ یہ سب راستے جانتا ہے۔"

"باب" ایک نوجوان انقلابی ہوگا۔ ملا محمد نے سوچا اور اس سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے اگر وہ کسی نئے مذہب کی تبلیغ کرتا ہے تو کتنے لوگ اس کے دام فریب میں گرفتار ہو سکتے ہیں وہ شیراز میں بیٹھا ہوا یہاں تک قزوین میں انہیں کیا نقصان پہنچا سکتا ہے؟

بابِ پنجم

شیراز جو گلگشت مصلیٰ اور رکناباد کے چشمے، حافظ کے مقبرے اور سعدی کی آرام گاہ کی وجہ سے ہی نہیں اپنے پھولوں کے لئے، اپنے باغوں کے لئے بھی مشہور تھا۔ "باب" نے اس جنت نظیر شہر میں بچپن گزارہ تھا اور پتہ نہیں کیوں اتنی کم عمری میں وہ سر پر کفن باندھ کر تیار ہو گیا تھا یا پھر دیوانہ ہو گیا تھا" خیر ملا محمد نے پردے چھوڑ دیئے۔ قزوین میں کبھی کبھار برف باری ہوتی تھی۔ تب سردی کی کاٹ شدید ہوا کرتی۔ ایران ایک جہان تھا۔ دنیا کے سارے موسموں کا مزہ یہاں پر مل سکتا تھا۔ ذرا اوپر بحیرہ خزر تھا ذرا سا سمندر مگر اپنی ساری رعنائیوں اور رنگوں کے پرتو سے خواب آگیں۔ دشت سے گلے ملتا ہوا کناروں پر روشنیوں اور بہار میں نغموں سے گونجتے شہروں سے گویا قازقی خاتون کے گلے میں پہنے زیوروں سے آراستہ، رس دار پھلوں کی بہتات بحیرہ روم کے ساحلوں سے ملتی ہوئی آب و ہوا۔ کھلے سمندروں اور بند سمندروں کی سرزمین جو آتشکدوں میں جلتی آگ کی وجہ سے مقدس ہے۔ اپنے ماضی کو آغوش میں لیے اس کے مردہ وجود سے زندگی حاصل کرتی ہوئی۔ کوفہ میں سید الشہداء شہید کئے گئے نجف اشرف میں وہ سوئے ہوئے تھے۔ جو "بابِ" علم تھے۔ باب۔ باب۔ علی محمد باب جیسے عبدالوہاب پتہ نہیں کبھی کبھار دیوانوں کو جوشِ جنون میں کیا سوجھتا ہے؟

ملا تقی اندر آئے وہ سخت خفا معلوم ہوتے تھے۔ انہوں نے کوئی سوال نہیں کیا ان کا لمبا کوٹ جس پر برف جمی ہوئی تھی بلالی نے اتار لیا تھا۔ اب وہ اسے جھاڑ کر دالان میں کھونٹی پر ٹانک رہا تھا

"محمد انہوں نے کھنکار کر گلہ صاف کرتے ہوئے کہا تم نے ام سلمیٰ کو نجفِ اشرف میں جانے کی اجازت دی ہے۔"

نہیں پدرِ محترم میں تو اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتا" اس نے سر جھکا کر کہا۔

آج جب میں بھائی صاحب کو پوچھنے کے لئے گیا تو انہوں نے ذکر کیا مرضیہ اور اس کا شوہر نجف اشرف اور کربلائے معلیٰ جا رہے ہیں۔ ام سلمیٰ بھی چاہتی ہے مگر میں پسند نہیں کرتا انہیں تو میں نے کچھ نہیں کہا مگر میں چاہتا ہوں تمہاری بیوی نہ جائے۔"

ملا محمد نے نہایت بے بسی سے باپ کی طرف دیکھا اور نگاہیں جھکا لیں۔ جی میں اسے معلوم تھا کہ اگر اس کی بیوی کلثوم نے یہ ارادہ باندھ ہی لیا ہے کہ جائے تو وہ اسے روک نہیں سکے گا ان کے معاملات ایسے ہی تھے۔ یہ ازدواجی زندگی جو بظاہر ٹھیک ٹھاک معلوم ہوتی تھی اکثر طوفانوں کی زد میں آتی رہتی تھی۔ لمبے خاموشی کے وقفوں کی وجہ سے اس کے علم و فضل کی وجہ سے۔ یہ بات نہیں کہ وہ اس سے مرعوب تھا یا سے بیوی کی پرواہ نہ تھی مگر کچھ تھا جو شروع سے ان کے درمیان حائل تھا۔ وہ اپنے خیالوں میں لپٹی گویا کسی اور دنیا میں رہتی۔ ملا محمد اپنے معاملات میں مشغول اور پھر طبیعتاً وہ اس کی شخصی آزادی میں مخل ہونا پسند نہ کرتا تھا۔ اپنے دوسرے بھائیوں کی طرح جو بیویوں کے خیالات کی ڈوری اپنے ہاتھ میں تھام کر رکھتے تھے وہ اس عورت کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا کہ اس کے سیاہ لمبے بالوں سے ڈھکے سر میں کیا ہے؟ ان بے طرح چمکتی آنکھوں کی سوچ میں ڈوبی نگاہ جو آسمانی بجلی کی طرح کبھی اس سے چھو جاتی تو وہ کانپ جاتا۔ بھلا اس سے وہ کیوں کر کہے گا کہ اس کا باپ اس کا نجف اشرف جانا پسند نہیں کرتا۔ یوں بھی عورت مرد کی طرح اپنے طور پر خود مختار ہونا پسند کرتی ہے۔ ہو سکتا ہے اس کے لاشعور میں ہو کہ وہ اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہے تم پہاڑ کے سامنے کب تک کھڑے رہ سکتے ہو؟ سورج کو شام کے وقت چھپنا ہی چاہیئے۔ ہاں وہ اس کے وجود کا اتنا عادی ہو گیا تھا۔ خادماؤں کے جمگھٹے میں گھر کے دالانوں میں ادھر ادھر اس کا چلنا پھرنا اس کی نازکی اور پھر اس کے بڑے سے گھیر دار لباس کا لہروں کی طرح آگے پیچھے ڈولنا۔ سرو جیسے کا سا قد اور لمبے دوپٹے کا اس کے عقب میں گھسٹنا۔ جذبات کی گرمی سے پگھلتا ہوا سراپا جو اتنا سرد تھا کہ اسے ہمیشہ اجنبیت کا احساس ہوا تھا اس لئے وہ خاموش رہے۔ باہر برف چپ چاپ گرتی رہی عارض کی سرخی لب لعلیں کے رنگ میں گھلتی ہوئی اور برفیلا لمس جس میں موتی کی سی غنمیت اور ٹھنڈک ہی ہوا۔ ہاں اگر وہ جانا چاہے گی تو وہ معترض نہیں ہو گا وہ اسے روکے گا نہیں۔ اس نے جی میں فیصلہ کر لیا۔ ملا تقی نے کہا شیخ احمد احسائی۔ ایک راندہ درگاہ شاہ شہیداں ہے یزد میں بیٹھ کر اس نے ایسی ایسی بیہودہ باتیں کی ہیں اور پھر وہ کاظم رشتی۔ غصے کے مارے وہ خاموش ہو گیا لاتنے مختلف فرقوں کا سرزمین ایران میں رواج اسے کبھی اچھا نہیں لگا۔

"یہ بات کوئی ہوش و حواس میں قبول کر سکتا ہے کہ روح اٹھے گی جسم نہیں،، ملا تقی نے پھر کہا

اب اگر کسی ایسے آدمی نے "باب" ہونے اور قائم کے ظہور کی خوشخبری دینے والا کہا ہے تو آہستہ آہستہ وہ اپنے آپ کو قائم بھی کہہ دیگا۔ یہ شیخیہ فرقہ والوں کی بدبختی ہے کہ وہ مذہب میں اس فسق وفجور کو رواج دے رہے ہیں" پھر کچھ دیر خاموش رہ کر اس نے پوچھا۔ "اس مسافر سے بات ہوئی"

نہیں پدر محترم۔ "البتہ میں نے شیراز سے آنے والے ایک کارواں کے سالار کو بلوایا تھا وہ خاصا سمجھدار پڑھا لکھا اور سلیقے سے سوچنے کا ڈھنگ جانتا تھا۔ اس نے کہا ہے کہ یہ امر ابھی پوشیدہ ہے کہ "باب" کا آئندہ کیا ارادہ ہے۔ ایک نہایت معمولی تاجر کا لڑکا جس نے عبادات اور مناجات سے اپنے اندر طاقت پیدا کر لی ہے۔"

لمبی "ہوں" کر کے ملاتقی قالینوں کے فرش پر ادھر ادھر ٹہلتے رہے۔ گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے غصے سے سلوٹیں پیشانی پر۔ ملا محمد مؤدب کھڑا رہا۔

میں نہیں چاہتا کہ ام سلمیٰ زیارات کے لئے جائے۔ کوئی طاقت ہے جو کہتی ہے کہ اسے گھر سے قدم باہر نہیں نکالنا چاہئے" ملاتقی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ محمد نے ان سے آنکھ نہیں ملائی۔ وہ ان کی بات نہیں سن رہا تھا۔ پتہ نہیں کیوں اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ حوصلہ رکھتا اور انہیں بتا سکتا کہ ام سلمیٰ کے جانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ وہ ہمیشہ ایک غیر عورت کی طرح رہی ہے۔ مگر اسے اپنے باپ کا دل توڑنے کا کیا حق تھا! اس لئے وہ داستانوں کی سی وہ رات چراغوں کی کمزور روشنی کے احاطے سے پرے برف گرتی ہوئی، ہوا دالانوں میں تیز تیز سانس لیتی سیٹیاں بجاتی ہوئی باغ میں شاخیں زور زور سے اپنے سر پھینک کر ماتم میں شریک۔ اور ملا محمد کو اپنی پسلیوں میں آگ کی طرح دل کا ٹکڑا دائیں بائیں ٹکراتا سنائی دیتا ہوا باوجودیکہ باپ کی نصیحت اسے معلوم تھی کہ وہ کسی قسم کی دخل اندازی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ پھر بھی اس کا جی گھبرا رہا تھا۔ یہ رات جس کے بعد صبح طلوع ہونا ممکن نہ تھی۔ کوہ البرز کی چوٹیوں پر بھی برف گر رہی ہوگی۔ وہاں کہیں ایسے اندھیرے ایسی وادیاں ایسے غار بھی ہوں گے جہاں آدمی کی آواز کا اسرار کبھی نہیں پہنچا ہوگا۔ انسان اس کائنات کا سب سے بڑا راز ہے۔ دو دل قریباً قریباً ہونے پر بھی الگ الگ دھڑکتے ہیں ان کے اپنے راز اپنے خیالات ہوتے ہیں۔ کچھ بھی جاننا ممکن نہیں جب یہ معمہ حل نہیں ہو سکتا کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ تو پھر لاف دانش غلط و نفع عبادت معلوم۔ وہ دریچے میں بیٹھا برف باری دیکھتا رہا۔ اندھیرے میں اس کے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی جسے وہ عروس کہتا تھا۔ جیسے دہکتی ہوئی آگ کمرے میں بڑھ گئی ہو۔ نہ غصہ تھا اور نہ ہی افسوس وہ اس سے کچھ پوچھنا اور اسے کچھ کہنا نہیں چاہتا تھا۔

وہ پلٹ کر روبرو ہونا نہیں چاہتا تھا پتہ نہیں وہ بے حسی سے باہر کیوں دیکھتا رہا وہ ہم کلام نہیں ہوا وہ خفا نہیں تھا بس کہنے اور بولنے اور آوازوں کے ٹکراؤ کی گونج سے بچنے کے لئے تیز ہوا کا ایک زبردست جھونکا آئے۔ منقش چھجے کو پھلانگتے ہوئے گالے اندر آ گرے۔

"آقائے محمد یہ تمھارے لئے ہے"، اور فنجان دریچے میں رکھ دیا۔

"ایک وقت سے پہلے برف گر رہی ہے"، سفید، پاک، معصوم۔ خدا کے کلام کی طرح"

وہ حیران ہو کر پلٹا۔ چراغ کی روشنی ایسے زاویے سے اس کی آنکھوں پر پڑ رہی تھی کہ عروس کی نگاہ میں چھپی ہنسی اسے دکھائی دی۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ وہ اس کے دیوان خانے میں آئی ہو۔ یہ علاقہ ممنوعہ تھا دشمن کی سرزمین۔ آج ایک فاتح کی طرح وہ یہاں موجود تھی مگر وہ مرعوب نہیں ہوا۔ آنے کا سبب پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ "تمہیں چچا نے بتایا ہو گا کہ میں مرضیہ اور اس کے شوہر کے ساتھ نجفِ اشرف جا رہی ہوں۔ مجھے معلوم ہے تم روکو گے نہیں مگر میں تمہیں بتانے آئی ہوں کہ یہ سفر ذرا لمبا ہو گا۔ کچھ زیادہ دن لگیں گے۔ میں سید کاظم رشتی کے درس میں شریک ہونا چاہتی ہوں۔ قائم آلِ محمد کے ظہور کا وقت قریب ہے۔ شرک و کفر کے برباد ہونے اور حق کے ظاہر ہونے کا وقت۔ میں چچا اور بابا سے کچھ نہیں کہنا چاہتی۔ مگر تم مجھے جانتے ہو۔ ساتھی باقی دنیا سے زیادہ ایک دوسرے کو بہتر سمجھتے ہیں۔ وہ تو کی عم زاد میں تم سے یہ رعایت چاہوں گی کہ تم مجھے اس سفر پر اپنی دعاؤں کے ساتھ رخصت کرو۔"

محمد نے کچھ نہیں کہا اس کم روشنی میں جو چراغ کے کٹہرے کو پار کر کے آ رہی تھی۔ اس کے گھیردار تیمے کی سلوٹیں نارنجی نظر آ رہی تھیں اور اس کے نرم دل آویز خطوط اور لمبی گردن کے اوپر لٹکا ہوا وہ چہرہ دلکش روشن تھا۔ ٹوپی پر ریشم کی رنگارنگی کی چمک ایک دلربائی سے پیشانی تک آئی ہوئی تھی اور کرنیں سی بکھری ہوئی تھیں۔ وہ اس بے مثال بے پناہ مکمل عورت کو دیکھتا رہا۔ بنا آنکھ جھپکائے بنا کوئی جواب دیے

"کل ہم رخصت ہو جائیں گے، مرضیہ کے شوہر نے سارا بندوبست کر رکھا ہے۔ وہ دونوں بھی زیارتوں اور حق کی تلاش میں جا رہے ہیں"، اس نے قالینوں کے فرش پر اور اس چوکی جہاں شیخ احمد احسائی کی کتاب کھلی پڑی تھی۔ جہاں حسین صادق اسے چھوڑ گیا تھا دیکھا۔

"حق کیا ہے عروس؟" گہری واضح سوال کرتی آواز اس بڑے سے لق و دق نہایت اونچی چھت والے کمرے میں گونجی۔

آج تک ملا محمد نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ تیرہ سال کے عرصے میں جو انہوں نے ساتھ گزارا تھا اس تحکم سے جس کی وہ قطعاً عادی نہ تھی اس سے کبھی پوچھا نہیں گیا تھا۔

"میں تو خود اس کی تلاش میں ہوں عم زاد" کیا تم حق کی تلاش میں نہیں ہو۔ دنیا کا ہر ذی شعور حق کو دیکھنا سننا چاہتا ہے تاکہ اپنے اندر اندھیروں سے جا رہا ہوں جب حق آئے گا تو انسان کو قید سے رہائی ملے گی۔ ہم میں سے ہر شخص ڈھونڈتا ہے تاکہ پا سکے۔ جو کچھ اس کے نصیب میں ہو۔ جو اس کا مقدر ہو "جاودانی زندگی یا جاودانی موت"

ہمیشہ کی طرح وہ پھر اس سے مرعوب ہو رہا تھا کھڑا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ کتنی خوبصورتی اور آسانی سے بات سمجھا سکتی ہے۔ اسے کاظم رشتی کے درس میں شریک ہونا ہی چاہئے وہ جب حق کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتی ہے تو اس کے گمراہ ہونے کا کیا ڈر ہے؟

"عروس اگر تم حق کے لئے جا رہی ہو تو جاؤ" وہ پیٹھ پھیر کر دریچے میں جا کھڑا ہوا۔ دل بوجھ سے اور غم سے بھکا جا رہا تھا۔ اسے محی الدین ابن عربی کی ایک غزل یاد آ رہی تھی۔

میں اپنی آرزوؤں کی خاطر چاہتا ہوں کہ وہ نہ جائے۔
میرے آنسوؤ بہو۔ میری آنکھو آنسو بہانا بند نہ کرو۔
میری آہو آؤ۔ اے میرے دل اب ریزہ ریزہ ہو۔
اور ساربان آہستہ چل میری پسلیوں میں آگ ہے۔
جدائی کے غم سے میرے آنسو خشک ہو گئے ہیں۔
جب رخصت ہونے کا لمحہ آئے گا کوئی آنکھ اشک آلود نہ ہوگی۔

لہریارریت کی وادیوں کی طرف جہاں ان کے خیمے ہوں گے اور میری محبت کی موت وہاں وہ ہوں گے جن سے میں نے محبت کی ہے۔

ہاں میں نے ام سلمیٰ سے محبت کی ہے یہ عجیب ساعت تھی کہ وہ جا رہی تھی وہ اسے اذن دے چکا تھا۔ صبح صادق سے بہت پہلے اونٹوں کی لمبی قطار میں پروئے ہوئے اپنے ہودے میں سوار ہوگی۔ ایسے وقت میں جب چیختی ہوئی ہوائیں تھک کر آرام کرتی ہیں۔ باد صبحگاہی چلتی ہے۔ یہ عجیب انکشاف تھا۔ ہاں وہ اس سے محبت کرتا تھا۔ اس کا دل ابھی یکسر پتھر نہیں ہوا تھا۔

عمر فاروق رضؓ نے فرمایا تھا کیا ہی اچھا ہوتا فارس کے اور ہمارے درمیان آگ کا پہاڑ ہوتا نہ وہ ہماری طرف آ سکتے نہ ہم ان کی طرف جا سکتے۔ اس کے باوجود اسلامی سلطنت کی حدیں پھیلتی چلی گئیں اور خود اسلام میں جو مذہبی موشگافیاں ہوئیں ان پر جتنا ماتم کیا جائے کم ہے۔ سلطنت حالانکہ کسی کی میراث نہ تھی۔ اگر رسول خدا انہیں ایک جگہ جمع نہ کرتے تو عرب اپنے شعوب وقبائل

کی مدح سرائی سے کبھی باہر آتے وہ ایک وحدت بنے اور پھر پارہ پارہ ہو گئے انہوں نے دنیا کے کناروں تک اپنی حکومتیں پھیلائیں اور دوسرے اثرات قبول کرتے چلے گئے۔ خاندان صفحہ ہستی سے نابید کئے گئے اور تباہ کئے گئے۔ کبھی عقائد اور کبھی فلسفوں نے لوگوں کا خون ارزاں کیا۔ ایران بھی عربوں کی برتری کو پسند نہیں کرتا تھا۔ امام حسن عسکری کے عربی النسل بیٹے کا جو پانچ برس کی عمر میں غائب ہو گیا تھا بھلا کیا راہ دیکھتا؟

علی محمد شیراز میں پیدا ہوا۔ وہ ایران کی سرزمین کا بیٹا اور سید تھا۔ وہ اٹھارہ سال کا تھا کہ سخت ریاضتوں اور مجاہدوں میں لگ گیا۔ اس کے عطار باپ نے یہ دیکھ کر کہ وہ عبادات کا دلدادہ ہے اسے نجف اشرف بھیج دیا۔ جہاں وہ اس موعودہ ہستی کے انتظار میں باقی لوگوں کے ساتھ لگ گیا۔

کاظم رشتی بے ثباتی عالم کا نمونہ صفوی بادشاہوں کی اولاد حکومت کی ساری پناہ گاہوں سے دور دشت میں رہتے تھے پھر شیخ احمد احسائی کے فلسفے کی جماعتوں میں انہوں نے تربیت نفس کی وہ ان ساری ہستیوں کا پرتو تلاش کرتے تھے جو آدمی کو آزادی بخش سکتی ہیں۔ ظلم و جور سے ستم اور استبداد سے۔

سید حسن عسکری کے بیٹے امام غائب کی راہ کب تک دیکھی جائے؟

دنیا کے لئے ان کا پیغام امن و آشتی صلح و قرار کے دور کا تھا۔

صفوی بادشاہوں کے بعد جنہوں نے کرمان سے بیس ہزار جوڑے آنکھوں کا خراج طلب کیا تھا اب کیا باقی رہ گیا تھا؟

علی محمد میں ایک اندرونی تجلّی تھی۔ جس کو ان کی دور رس نگاہوں نے دیکھ لیا تھا۔ ایران مہدی موعود کی انتظار میں اب عرب کی طرف نہیں دیکھے گا۔ بھلا یہ کیا ضروری ہے کہ مہدی مدینہ میں پیدا ہو۔ کیا قرآن کو ہدایت کا سرچشمہ ماننے والے اس قابل نہ تھے کہ وہ مہدی کے بار امامت کو اٹھا سکیں؟ دنیا فسق و فجور سے بھر چکی تھی اور ایک ہزار سال سے زائد عرصہ گزر جانے پر اس کو حق پہنچتا تھا کہ وہ موعودہ ہستی کے انتظار سے یا ہاتھ اٹھالے یا پھر اس عرصہ تک کے لئے اپنے زخموں پر کوئی اور مرہم رکھے۔

خوابوں اور بشارتوں کا سلسلہ جاری تھا اس شدّت احساس کی وجہ سے جو لوگوں کے دلوں میں تھا۔ ام سلمٰی نے اپنے سکندر کے ہاتھ سے سید کاظم رشتی کو جو خط لکھا تھا۔ اس میں ان سے پوچھا تھا۔

۱:۔ ہمہ اوست اور ہمہ از اوست کیا ایک ہی سوال کے پہلو نہیں ہیں؟

۱۲۔ معجزات کی حقیقت کیا ہے؟ شجر حقیقت کیا ہے؟

۱۳۔ کیا صاحب کتاب ہونا کافی نہیں؟ کیا کتاب کا ہونا ایک معجزہ نہیں ہے۔

۱۴۔ رسول آخر الزماں سے کیا مراد ہے؟ ہدایت کے راستوں اور آئمہ اطہار کا فیصلہ کون کریگا؟

۱۵۔ کیا اس چہرے کی چمک چندھیا نہیں دے گی جو خود قرآن ہو؟

کاظم رشتی اس خط کو پڑھ کر کانپ گئے۔ یہ ملا صالح کی صاحبزادی کا خط تھا۔ انہوں نے درس بند کرنے کا حکم دیا ان کی طبیعت اچھی نہیں تھی وہ خلوت میں جا گزیں ہوئے۔ اپنے حجرے میں پہنچ کر وہ اس تار تار قالین پر تقریباً گر پڑے جو برسوں سے ان کی خدمت کر رہا تھا۔ یہ ایک عورت کا خط تھا عورتیں جن پر تعلیم کی راہیں بند تھیں صفوی بادشاہوں نے ملک کی آدھی آبادی کو بیکار کر دیا تھا۔ وہ گھروں کی زینت تھیں اور بس ان سے کوئی بات مذہب اور حقیقت سے متعلق نہیں کی جاتی تھی۔ انہوں نے اتنی دور بیٹھے اس کا شہرہ تو سنا تھا۔ وہ عالمہ ہے اس کو خواب نظر آتے ہیں آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ وہ مقدس ہے مگر انہوں نے دور سے آتی خبروں پر کم ہی یقین کیا تھا۔ وہ بہت مضطرب تھے اور چاہتے تھے کہ اس سے ملیں اور اس کے شبہات اور سوالوں کا جواب دیں۔ کئی سوالوں کے جواب تو خود انہیں بھی معلوم نہ تھے۔ یہ نہیں کہ وہ اس سے عاجز تھے مگر مستقبل کا علم آدمی کو نہیں دیا گیا۔ پھر یہ سوال وقت چاہتے تھے بحث و مباحثہ جس سے خیالات کی دھند صاف ہو کر جالے علیٰحدہ کئے جائیں۔ خواب تو انہیں بھی پریشان رکھتے تھے مگر ان کے خواب دوسرے تھے۔ ایک عورت کو تسلی بخش جواب دینا مشکل ہوتا ہے کیونکہ اوّل تو خواتین ایسے سوال نہیں کرتیں اور اگر ان میں یہ جرأت ہے تو وہ ایک چھٹی حس ہوتی ہے جس کو فوراً چند لفظوں کے الجھاؤں اور فلسفوں کی بے ربط اصطلاحوں سے سکون نہیں بخشا جا سکتا۔ جب عورت جسم سے آگے نکل آئے تو وہ ایسی آزاد روح ہوتی ہے۔ جس کا مقابلہ مرد نہیں کر سکتا۔ وہ ایک ایسا چھلکتا ہوا جام ہوتی ہے ایک ایسی جھیل جو لبالب کناروں سے باہر نکلنے کو بے قرار ہو۔ اس کی رُوح سیراب کرنے اور فلسفوں کی دقیق گتھیوں کو سلجھانے میں کہیں تیز ہوتی ہے۔

کاظم رشتی کئی دن سوچتے رہے ان کا جی درس دینے میں بھی بھٹکتا رہتا۔ ملا صالح کی صاحبزادی ان کی آزمائش بن گئی تھی۔ جواب لکھنے سے پہلے انہوں نے سوچ بچار کا فیصلہ کیا کہ چاہے ملا تقی ان کو مروا دے (کیونکہ صفوی بادشاہوں نے ملاؤں اور مجتہدوں کو دین کے پاسبان اور دنیا کے ٹھیکدار بنا دیا تھا) اسے اپنے پاس ضرور بلائیں گے انہوں نے لکھا۔

قرۃ العین سے! تمہارا ہمارے درس میں شریک ہو کر ان نازک سوالوں کا جواب جاننا

بہت صف روری ہے!

قافلہ آکر سرائے میں ٹھہرا وہ زیارت کرنے کے فوراً بعد درس میں حاضر ہوئے۔ مدرسے میں نہ کوئی آواز تھی اور نہ ہی کوئی رونق۔ موت کی سی ویرانی تھی۔ احاطے میں درخت پر چیلیں بیٹھی ہوئی وقفے وقفے سے "کطعی" "کطعی" کہہ کر خاموش ہو جاتیں۔ مرضیہ نے بہن کا بازو پکڑ لیا۔ خواہر مجھے ڈر لگتا ہے واپس چلو ہم پھر کسی وقت حاضر ہوں گے۔ وہ بڑے دالان میں قالینوں کے فرش پر ایک طرف بیٹھ گئیں۔ مرضیہ کا شوہر دوسری طرف بنی مسجد کے حجروں میں گیا ایک جماعت چپ چاپ مراقبے میں گویا عبادت میں لگی تھی۔ صحن میں حوض پر ایک نابینا وضو کر رہا تھا۔ محمد علی نے اس سے پوچھا، کاظم رشتی کہاں مل سکیں گے؟

سید کاظم رشتی کا وصال ہو چکا ہے؟ اس نے بہت ہولے سے کہا۔

اسے یقین نہیں آیا، "تم کس کی بات کر رہے ہو" محمد علی نے پھر پوچھا۔

آقا آسمان پر ایک خدا ہے زمین پر ایک ہی سید کاظم رشتی تھے۔ جن کا انتقال آج سے ٹھیک دس دن پہلے ہو چکا ہے۔ یہ لوگ جو اندر بیٹھے ہیں مراقبے میں ہیں اور میرے سوا یہاں کوئی نہیں کہ تم اس سے جواب کی صحت کر سکو۔

محمد علی درسگاہ میں آیا۔ ام سلمیٰ کو برقعے اور پردے کی یوں بھی کوئی خاص پرواہ نہ تھی اور مرضیہ تو بہن کی پرستش کرتی تھی دونوں کے چہرے سیاہ نقابوں کے پیچھے گویا چمک رہے تھے۔ جب اس نے بتایا کہ کاظم رشتی نہیں رہے تو اس نے ام سلمیٰ کے چہرے کو سیاہ ہوتے دیکھا گویا دھواں اس پر چھا گیا ہو پھر وہ اٹھی اس نے وضو کیا اور اس حجرے میں متکف لوگوں کی جماعت میں شامل ہو گئی۔ یہ دعاؤں مناجاتوں اور عبادتوں کا وقت تھا۔ مرضیہ اور محمد علی اپنی سرائے کی طرف روانہ ہو گئے۔ جہاں دو کمرے بطور خاص ان کے لئے مخصوص تھے۔ شہر اپنی اداسیوں اور بے رونقی سمیت آباد تھا۔ کاظم رشتی کے بعد متکف ہوئے لوگوں کا چرچا ہر جگہ تھا اور اس میں ایک عورت کا ذکر بطور خاص آتا تھا جو جانے کہاں سے آکر ان میں شامل ہو گئی تھی۔ وہ بہت مضطرب تھے کبھی یہ نہیں ہوا کہ کوئی عورت مردوں کی جماعت میں نہایت بے پرواہی سے داخل ہو گئی ہو۔ عورتیں مسجدوں میں بھی نہیں آتی تھیں۔ زیارات کے لئے آنے والی بھی اپنے پردے کی وجہ سے زیادہ دیر کسی مسجد میں نہیں جاتیں۔ ملا اور مجتہد سخت پریشان تھے۔ وہ اس خاتون کو ایسا کرنے سے کیسے روکتے؟ وہ اسے گھسیٹ کر ان کے درمیان سے کیسے نکال باہر کرتے؟ وہ کسی وقت بھی اپنے مراقبے سے باہر نہیں آتی تھی۔ جیسا ہر موت کے بعد ہوتا

ہے۔ رفتہ رفتہ مسجد کی رونقیں لوٹ آئیں۔ لوگ نماز کے لئے آتے۔ وہ اُس ایک برقعہ پوش خاتون کو دیکھنے کے عادی ہو چلے تھے۔ مرضیہ اور محمد علی بلاناغہ صبح و شام درس گاہ کا اور مسجد کا چکر لگاتے مگر نجفِ اشرف میں اس سے ہمکلام ہونے کے لئے انہیں بہت انتظار کرنا پڑا

نجفِ اشرف جہاں حضرت علیؓ کی پُر نور مرقد ہے جو قریش کے نورِ نظر تھے مسلمانوں کو جن کی ذات پر فخر تھا جو بعض لوگوں کے لئے رب کا درجہ رکھتے تھے۔ کربلا کے اس شدید المیے میں اپنی ذات میں شریک تھے جن کے خاندان کے ساتھ سخت ناانصافی کی گئی جو سینکڑوں مذہبوں، قصوں اور داستانوں کا عنوان بنے ایران جن کے دم سے آباد تھا اور نجفِ اشرف شیعہ لوگوں کا مدینہ تھا وہ ایسی جگہ جہاں ماضی حال کے ساتھ سویا پڑا لگتا ہے۔ سویا ہوا ہے۔ اسلام میں حضرت علی رضؓ کی ذات بابرکات سب سے زیادہ تنازعوں کی وجہ بنی۔ نبوت قریش میں کسی واسطے سے نہیں آئی تھی۔ وہ ولادت باسعادت جس پر دنیا کو فخر ہے۔ وہ وجہ وجودِ کائنات اس خاندان میں پیدا ہوئے۔ وہ حضرت علی رضؓ کے عم زاد تھے۔ حضرت موسیٰؑ نے اپنے بھائی ہارون کے لئے اپنا وزیر ہونے کی دعا کی تھی۔ رسولِ خدا کے لئے پوری انسانیت اپنا خاندان تھی۔ وہ کسی ایک کے حق میں دعا کیوں کر کرتے؟ کُل روئے زمین کو ان پر ناز تھا۔ وہ جملہ انسانیت کے لئے رسولؐ تھے خدا کے پیغامبر۔ مگر شیعہ حضرات کو آلِ علی کی حق تلفی اس میں نظر آئی۔ خود حضرت علی کی حق تلفی۔ اور یہاں سے اسلام میں اتنے فساد ہوئے اتنے خون کے دریا بہے کہ زمانہ رنگین ہو گیا۔ ایک عقیدہ رکھنے والوں کا خون دوسروں کے لئے مباح ہوا۔ سیاہ پوش اور سبز پوش فرقے بنے اور پھر بٹتے ہی چلے گئے۔

قرۃ العین کہنے والا اب نہیں رہا تھا مگر وہ قرۃ العین تھی۔ زمانے کی آنکھ کی پُتلی، مرشد کی آنکھوں کی ٹھنڈک، درس گاہ کے اندھیروں میں کوئی روشنی نہ جھلملائی۔ ملا حسین بشروئی اور بعض دوسرے عراق، عجم میں پھیل کر استاد کی تلاش میں لگ گئے۔ استاد جو ان کا رہبر اور رہنما ہو۔ استاد جو اُلجھے ہوئے فلسفوں کو ان کے لئے آسان کرے استاد جس کی بشارت انہیں خوابوں اور مراقبوں میں ملی تھی استاد جو ایک نیا قانون ایک نیا مذہب ان کے لئے لائے۔ کاظم رشتی اسی وجہ سے تو پردہ پوش ہو گئے تھے۔ کہ حق ظاہر ہو۔ پتہ نہیں حق کو ان سے کیا کد تھی وہ ان کے سامنے کیوں ظاہر نہیں ہو سکتا تھا۔ قرۃ العین نے درس دینا شروع کر دیا۔ بہرحال وہ کسی کام آ رہی تھی۔ ریاضت سے اس کی آنکھوں کا جلال اس کے چہرے کے جمال میں مل گیا۔ وہ نکھر گئی جیسے بارش کے بعد کی فضا ہو۔ نیلی نیلی دھلی دھلی جیسے شبنم کے قطرے میں آسمان کی ساری ٹھنڈک اتر آئی ہو۔ یہ عجیب حکایت شوق ہے؟ ہر رات

میں ایک ہی خواب دیکھتی ہوں۔ اس رخِ زیبا کی ایک جھلک کے لئے میرا دل نہایت بیتاب ہوتا ہے۔ وہ پردوں میں چھپا ہے کبھی وہ ہوا پر کھڑا ہے اور مناجاتیں پڑھ رہا ہے۔ جیسے کہیں رگِ جان کے قریب ہو اور دکھائی نہ دے۔ روشنی کی طرح ساری جگہ اس سے بھری ہے۔ جیسے وہ پیدا کرنے والا ہو۔ خدا ہو۔ توبہ توبہ اس نے سوچا کہیں وہ بہک تو نہیں گئی۔ پھر اس نے چالیس دن کے ختم ہونے کے بعد انہیں جمع کیا اور اپنا دردِ دل ان سے بیان کیا۔ شدتِ جذبات سے اس کے دل کے اندر اتر جانے والی آواز گھبرائی ہوئی تھی۔ ملا حسین بشرویئی نے کہا کہ وہ مغرب و مشرق میں پھیل کر اسے تلاش کریں گے چاہے اس راہ میں ان کی جانیں کیوں نہ چلی جائیں۔ اصل میں سید کاظم رشتی کے وصال کے بعد سے وہ بے آسرا ہو گئے تھے۔ کاظم رشتی نے کہا تھا وہ اس لئے جا رہے ہیں کہ حق ظاہر ہو۔ حق کہیں قریب ہی ہونا چاہیئے ایسا کہ وہ اس کی آہٹ اپنے دلوں میں سن سکیں۔

بابِ ششم

ملا حسین بشروئی نے علی محمد کے دروازے پر جا کر شیراز میں ستانے کے لئے ایک ٹھکانہ پایا تھا۔ وہ سید کاظم رشتی کے دروس میں شریک رہے تھے۔ وہ نوجوان سید شاید تلاش میں اس کی مدد کر سکے۔ علی محمد نے کہا "آج میں صبح سے مسجد کی طرف نہیں گیا میرا دل کہتا تھا تم آؤ گے بشروئی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ان کی اتنی گہری دوستی نہیں تھی کوئی دعوی الیمپائی نہیں تھا وہ تو اپنی تلاش کے سلسلے میں حافظ اور سعدی کے اس شہر آیا تھا۔

علی محمد نے کہا تم جس کی تلاش میں ہو اس کی نشانیاں کیا ہیں؟

ملا حسین بشروئی نے احمد احسائی کے شیخیہ فرقے کے عقائد بتائے۔

علی محمد نہایت مضطرب تھا۔ پھر اس نے سورۃ بقر کی تلاوت کی اور ایسے نکات بیان کئے کہ ملا حسین حیران ہوا۔ پھر اسے سورۃ یوسف پڑھ کر سنائی اور اس کی تفسیر بیان کی۔ یہ اسرار و رموز ایسے تھے کہ ان کے نئے پن پر تعجب ہوتا تھا۔ ملا حسین نے کہا بیشک یہ ایک بہت بڑے ذہن کا کام ہے وہ اپنے دوست کو نگاہِ ستائش سے دیکھتا گیا۔ یہ خدا کی مہربانی تھی۔ اگلے دن ایلخانی مسجد میں وہ سب اکٹھے ہوئے اور طے یہ ہوا تھا کہ ملا حسین ہستی موعودہ کی نشانیوں کے متعلق وعظ کرے گا مگر مسجد میں اس کی زبان بالکل گنگ تھی اور وہ کوئی ایک بات کہنے پر بھی قادر نہ ہو سکا۔ پھر دوسرا اور تیسرا دن بھی اسی طرح گذرا۔ جھنجھلا کر اس نے کہا "پتہ نہیں یہ کون جادوگر ہے جو میری زبان بندی کئے ہوئے ہے؟

علی محمد نے کچھ جواب نہیں دیا۔ وہ سخت مضطرب تھا۔ پھر وہ اندر اپنے حجرے میں بنا کچھ کہے چلا گیا۔ حسین بشروئی چلے جانے کی وجہ سے پریشان تھا مگر باہر رات بہت طوفانی تھی جیسے زمین کی روحیں سر کے بال کھولے شیطانی قہقہے لگاتی ایک دوسرے کے تعاقب میں آوارہ ہوں

شمع کی لو ٹمٹمائی اور پھر بجھ گئی۔ چاروں طرف سخت اندھیرا تھا جس میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ ملا حسین بشروئی نے دیکھا کہ ایک شمع کی لو اونچی ہوئی اور ہوا میں اس طرح کھڑی رہی نہ کانپی اور نہ بجھی پھر اس روشنی کے اوپر ایک چہرہ تھا جو مناجات میں پڑھ رہا تھا اور اس کی آنکھ جھپک نہیں رہی تھی۔ ملا حسین بشروئی ڈرا اور سجدے میں گر گیا۔ کیا یہ قیامت تھی۔ یہ خدا کا چہرہ تھا اپنی نشانیوں کے ساتھ اپنی قوت کے ساتھ۔ وہ سجدے میں پڑا پڑا اپنی اور سارے جہانوں کی بخشش کے لئے دعائیں کرتا رہا۔

یہ انکشافات کی رات تھی۔ یہ فیصلہ کن رات تھی۔ کیونکہ یہ خدا کے جلال کی رات تھی۔

علی محمد جب حجرے میں داخل ہوا۔ آندھی کب کی تھم چکی تھی۔ چاندنی نرم اور محبت آمیز کمرے میں بھری تھی سحر کا وقت تھا سارے زیادہ روشن تھے اور قریب لگتے تھے مرغ اذانیں دے رہے تھے ملا حسین بشروئی اپنے پورے وجود سے کانپ رہا تھا۔ پھر لگا ہر شے بولنے اور گواہی دینے لگی ہو۔ اور وہ موعود اپنی موجودگی سے روح کو جگا رہا ہو۔ جیسے ہوائیں کوئی بے لفظوں کا گیت گائیں اور فضا ایک بے مثل مشاقی سے طنبورہ بجا رہی ہو۔

ملا حسین بشروئی نے سامنے دیکھنے کی کوشش کی مگر اس سے دیکھا نہ گیا۔ یہ خدا کا چہرہ تھا حق اللہ اس کی آنکھیں اس روشنی کے سامنے ماند پڑ گئیں۔ ایک بار پہلے طور کی تجلی کو موسیٰؑ نے دیکھا تھا اس درخت کو جس میں اللہ کا نور تھا مقدس آگ۔ وہ درخت شجر حقیقت تھا۔ اس میں موسیٰ نے اپنے رب کو دیکھا تھا۔ رب جو رب الارباب بھی ہے۔

علی محمد کی آواز صورِ اسرافیل کی طرح اسے سنائی دی۔ بشارت ہو کہ تم نے اپنے رب کو دیکھا۔ تم بابِ علم کی حقیقت سے روشناس ہونے۔ میں یعنی باب تم کو حکم دیتا ہوں کہ تم اٹھو اور جو کچھ تم نے دیکھا ہے اسے لوگوں سے کہو۔"

اس سے اس کی ڈھارس بندھی۔ کپکپی ذرا تھمی۔ اس نے اپنے سامنے اس شیرازی جوان کو دیکھا جو اتنا جاہل نہیں تھا جتنا سید محمد کاظم شاہ رشتی اسے کہتے تھے۔ جو سورہ یوسف کو احسن القصص کہتا تھا۔ اب وقت آگیا تھا اس نے آتے ہوئے قرۃ العین سے وعدہ کیا تھا کہ اگر اسے وہ ہستی موعود وہ استادِ زماں مل گیا تو وہ اس کا خط اس منزل تک پہنچا دے گا جس کے لئے اسے لکھا گیا تھا۔

تم طاہرہ کا خط مجھے دکھانے آئے ہو۔ میں جانتا ہوں جو اس نے لکھا ہے۔ لمعات وجہک اشرقت وشعاع طلعتک اعتلا، زچہ او الست بربکم نزنی بزن کہ بلیٰ بلیٰ بجراب طبل الست توزد

لا چو کوس بلا زدند، ہمہ خیمہ زد بدر دلم سپہ غم وحشم بلا ـ من وعشق آں مہ خوبروکہ چوزد صلای بلی بروِ،
بہ نشاط وتہقہہ شد فرد کہ انا الشہید بکربلا ـ

وہ خط کو کھولے اور اپنے سامنے کئے دیر تک یونہی بیٹھا رہا۔ ملا حسین بشروئی کو معلوم ہوا جیسے
دور کہیں سرِ پردۂ اسرار سے پرے اس کی نگاہ ہو عالم لاہوت تک اور اس کے پار تک وہ اس
چھوٹے سے حجرے میں جس کے دریچے بھی اونچے نہ تھے حدِ امکان سے آگے نکل گیا ہے ۔تیزی سے
سفر کرتا ہوا وہ آسمان کو اپنی پرواز کی گردِ راہ بنانے ہے حسین بشروئی کو یہ سب یوں اس کے
اندر دکھائی دیا جیسے وہ کسی آئینے میں یہ نظارہ کر رہا ہو۔ ہاں جھلملاتے ہوئے آئینے جن کے
اندر وہ حبابوں کے اٹھنے کا نظارہ کر رہا تھا۔ یہ آسمان سات نہیں تھے بیشمار تھے اور کائنات جو
لفظِ کُن نے پیدا کی تھی ایک نقطے کے گرد گھومتی تھی اور یہ نقطہ خود وہ تھا۔ مقامِ یقین مقامِ نکتہ
اور نکتہ مقامِ حقیقت ہے اور وہ مقامِ ذرہ وجود ہے جو تمام چیزوں کے فنا کا مقام ہے اور دس
ہزار حجاب نور وظلمت کے ہیں۔

اصل دین اللہ کی معرفت ہے ۔ یہ نکتہ علوم کا نقطہ ہے ۔
علم کا نقطہ حق الیقین ہے ۔ علم الیقین ۔ عین الیقین ۔ حق الیقین ۔
نقطے کے مقام پانچ ہیں ۔ وہ ھاء کا مقام ہے ۔
ھ چار مرتبہ ترقی کر کے کاف ہو جاتی ہے ۔
کاف کے چار نقطے ہیں ۔ انسان کے چہار نفس ہیں ۔

مشیت ۔	نفس امارہ ۔	شانِ جہلِ مطلق
ارادہ ۔	نفس ملہمہ ۔	مقامِ شک
قدر ۔	نفس لوامہ ۔	مقامِ ظن
قضا	نفس مطمئنہ ۔	جو سرچشمۂ علم ہے ۔

اور جس کو ان نقطوں کی معرفت ملتی ہے ۔ اس پر علم کے دروازے کھل جاتے ہیں ۔
تمام معرفتیں ۔ اسماء وصفات ۔ سر وایجاد ۔ ثمرۂ قوسین نزول وقوسِ صعود ۔ نار ونور
کی حقیقت ۔ قرب وبُعد کا جوہر ۔ جنت اور جہنم کا فرق ۔ اقلیم اختیار وفراق ۔
ملا حسین کو وہ سب مناجاتیں یاد ہو گئیں جو "د باب" نے اس کے ذہن میں اس کے دل
میں ڈال دی تھیں ۔ اس نے نہایت عاجزی سے اپنی بندگی کا اقرار کیا اور کاظم رشتی کی درس گاہ

کی طرف چل پڑا۔ اس کا دل اتنے بڑے بوجھ سے بیٹھا جارہا تھا جو کچھ اس نے دیکھا تھا جو کچھ اس نے سنا تھا اس کے پاس لفظ نہ تھے کہ وہ انہیں بیان کر سکتا۔ کیا وہ ،حرف، "باب" تھا نہیں وہ "باب" نہیں تھا۔ مگر وہ یہ سب کیسے بیان کرے گا۔ وہ عاجز تھا اور اب پھر اس کے خیالات گڈمڈ ہو رہے تھے۔ دھندلا رہے تھے۔ سیاہ رات کا سویرا ہو گیا تھا؟

باب نے کہا تھا "کسی نے خدا کو نہیں جانا سوائے میرے اور تمہارے۔ کسی نے مجھے نہیں جانا سوائے تمہارے اور خدا کے اور کسی نے تمہیں نہیں جانا سوائے میرے اور خدا کے"

ملا حسین بشروئی "تم باب الباب ہو۔ لوگ مجھ تک تمہارے وسیلے سے پہنچ سکیں گے مگر اس امر کو ابھی پوشیدہ رکھنا ہو گا۔ مناسب وقت تک کے لئے"

اٹھارہ افلاک کے اٹھارہ حروفِ حی ہیں ہر فلک کی کنجی وہ حرف ہے تم اور تمہارے وہ تمام ساتھی جو مراقبوں میں موعود کی تلاش میں رہے میرے حروفِ حی ہو"

یہ تو بالکل ایک نیا مذہب تھا جس کی چمک اس کی نگاہوں کو خیرہ کئے دیتی تھی۔ ایران کا اپنا مذہب۔ اپنی وحی، اپنے قوانین اور اپنے "باب" کے ساتھ مکمل "باب" نے اسے قرآن کریم جس طرح پڑھ کر سنایا تھا وہ اعراب سے آزاد تھا۔ اس نے جو نقطہ کا ف تھا بالآخر جادۂ مستقیم دکھایا تھا۔ جس کی صدیوں سے ایران کو تلاش تھی۔ اس میں اوستا کی سی چمک دمک تھی خدا اور اس کے افلاک کا اتنا مکمل علم آج سے پہلے کسے نصیب ہوا ہے۔ ہاں آتشکدوں میں آگ کو روشن رکھو۔ گرجوں میں عیسائی عبادت گاہوں میں مبارک کے گیت گاؤ۔ کیونکہ وہ محبوب جس کے ہاتھوں سے مر ٹپکتا ہے جس کی انگلیوں سے رقیق مر ٹپکتا ہے بالآخر دروازے پر کھڑا تھا۔ وہ بانکے بہاری کرشن مراری وہ جادوئی نگاہ رکھنے والا مہربان آخر کار گوپیوں کے درشن کے لئے کھڑا تھا۔ دروازے کھل گئے تھے حجاب اٹھ گئے تھے اور مرکزِ حیات عینِ نظر تھا۔ یہ ملاقات دو ایسے انسانوں کے درمیان تھی جن میں سے ایک ہمہ شوق، ہمہ انتظار ہمہ گوش تھا اور دوسرا غش کھاتا ہوا جیسے راہ میں ٹھوکروں سے اس کے سارے وجود کو زخم پہنچا ہو۔ چند جھلی ہوئی آنکھیں کھلی ہوئی اور جھپتی ہوئی اور بہت بھاری بوجھ کو اٹھانے سے جھکا ہوا۔

چلمن کے پیچھے سے وہ ملا حسین بشروئی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پردوں کے پار سے بھی وہ نگاہیں اسے دہلا رہی تھیں وہ بھلا اکیلا آتی تجلیوں کی تاب لا سکتا تھا؟

کیا تم اپنی تلاش میں کامیاب ہوئے؟

آنسو انڈے سے چلے آتے تھے اس کے دل میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ تیز تیز ممکن اور ناممکنات کے سنگھم پر اتنی بجلیاں تھیں جیسے بجلیاں رہ رہ کر سیاہ بادل کے اندر لہریا کھیل کھیل رہی ہوں۔ وہ اسے کیا بتائے کس طرح وہ سب بیان کرے جو اس نے دیکھا تھا۔ لفظ کہاں سے لائے کہ وہ سب اسی طرح اسے سمجھا دکھا سکے۔ پتہ نہیں وہ خواب تھا یا حقیقت۔ اور وہ جہالت کی کونسی منزل پر تھا۔ آدمی کو اپنی عقل پر کتنا ناز ہوتا ہے۔ اس نے سید کاظم رشتی کے دروس میں جو تربیت حاصل کی تھی وہ اس کا ساتھ چھوڑ رہی تھی وہ اب پھر وہی جاہل آدمی تھا۔ جو مرشد کی نظر کرم سے پہلے تھا۔ جس کو مطالب و معانی۔ انوار و تجلیات۔ فیض اور توفیق فیض کے معانی سے شناسائی نہ تھی اور اب تو اس کو اپنے دیکھے ہوئے پر شک تھا یہ اس کی نظر بندی ہوئی تھی جو دکھانا چاہا گیا وہ اس نے دیکھ لیا

ملا حسین بشروئی تم نے دیارِ شیراز میں کیا دیکھا کیا سنا تمہاری یہ حالتِ غیر کیوں ہے؟

نہایت آہستگی اور جیسے بہت بے دلی سے اس نے سر اوپر اٹھایا اور حلیمن کی طرف دیکھا کسی غریب الدیار یتیم کی طرح باتیں اس کے منہ سے نکل رہی تھیں وہ کھویا کھویا سا تھا۔

"کیا تم نے اس استاد کو پا لیا وہ نورِ مبین دیکھ لیا جس کی بشارت ہمیں مراقبے میں ملی تھی!

سوال ہوا وہ سجدے میں گر گیا شاید یوں وہ اپنے وجود کو ریزہ ریزہ ہونے سے بچا سکے۔ زمستانی ہوا سے پتے بکھرے ہوئے تھے اور وہ انہیں سمیٹ رہا تھا ان پر گر گر انہیں اپنے دامن میں اکٹھا کر رہا تھا اسے لگا! وہ معدوم ہو رہا ہے مٹ رہا ہے فنا ہو رہا ہے اور زمین کے نیچے طاقت ہے جسے پکڑ کر شاید وہ اکھڑنے۔ اڑنے۔ بکھرنے سے بچ سکے۔

قرۃ العین اپنی ذہانت کے باوجود ملا حسین بشروئی کی حالت سمجھنے سے قاصر تھی۔ اندر کہیں لاشعور میں اسے یقین نہیں آیا تھا کہ ان کی تلاش کا انجام کچھ ہو سکتا ہے۔ محنت، ریاضت کوشش مناجاتیں اور شدید آرزو کی طلب اور تڑپ بار آور ہو سکتی ہے۔ وہ اپنی ساری آزادی کے باوجود سمجھتی تھی کہ وہ جو غائب ہے اور ظاہر ہونے والا ہے وہ اپنے آپ کو خود ظاہر کرے گا کیا اس کے لئے جو ساری دنیا کے لئے مسیح ہوتا کوچہ بہ کوچہ، کو بہ کو ڈھونڈنے کی ضرورت ہوگی جب سورج نکلتا ہے تو بس طلوع ہوتا ہے۔ دبیز بادلوں۔ برفیلے آسمان، تند و تیز آندھیوں میں بھلا وہ چھپ ہو سکتا ہے چھپ سکے گا۔ مسجد میں متکف ہو کر ملا صالح کی صاحبزادی نے سوچا تھا کہ وہ اپنا آپ جو اس کے ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا تھا پا سکے گی۔ آدمی ہوا کو پکڑ سکتا ہے مگر جب اس کا اپنا آپ اس کی آنکھوں کے سامنے بکھرنے لگے جیسے زندگی کے تار و پود

تو وہ یا دیوانہ ہو سکتا ہے یا پھر امر ہونے لگتا ہے۔ جب اسے خواب نظر آتے ہیں تو یہ جذبانیت کی انتہا ہوتی ہے۔ مگر حضرت یوسف کو خواب آیا کہ چاند ستارے انہیں سجدہ کر رہے ہیں اور پھر انہیں چاند ستاروں نے سجدہ کیا۔ ہاں سچ مچ سجدہ کیا۔ جب عزیز مصر اپنے خواب کی تعبیر سے عاجز ہوا تو حضرت یوسف نے انہیں خواب کا مطلب سمجھایا۔ وہ بھی ایسے ہی یوسف گم گشتہ کی تلاش میں تھی جو ان خوابوں کا مطلب اسے سمجھا سکے۔ ایسی تعبیر جو اس کا ذہن قبول کر سکے۔ وہ کسی کم تر درجے کی تعبیر کو قبول نہیں کر سکتی تھی۔ وہ تو حق کی تلاش میں نکلی تھی مگر کاظم رشتی نہیں رہے تھے اور اسے بنا کسی رہبر کے راہ تلاش کرنا تھی وہ سب جو اس کے ساتھ اس کے گرد تھے اس کے خاک پا بھی نہیں تھے وہ قائم آلِ محمد کی تلاش میں بہت دور نکل آئی تھی اس نے اپنی کشتیاں اپنے پیچھے جلا ڈالی تھیں ماضی دور پرے ایک ٹمٹماتی روشنی کی طرح جو دور ہٹتی جا رہی ہو روز بروز کسی گزرے ہوئے عالم کی بات تھی وہ تناسخ ارواح کی قائل نہ تھی مگر اسے یقین تھا وہ کسی بڑے مقصد کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اتنی بہت سی ذہانت اسے یونہی نہیں ملی۔ ملا حسین بشروئی نے بہت نحیف و نزار آواز میں کہا

"میں وہ خط منزلِ مقصود تک پہنچا آیا ہوں"

وہ بیٹھے سے کھڑی ہو گئی نہایت بے چین جسم جیسے انگاروں پر دھر دیا گیا ہو۔ خون میں کھلبلی مچی ہوئی اس کے پاؤں کسی آتش فشاں پر تھے اور زمین کی پنہائیاں اپنی ساری رنگینیوں نظاروں اور دل فریبیوں سمیت اس کے سامنے ظاہر ہو گئیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سے پردے سرکنے لگے سانس یوں تیز چل رہی تھی جیسے وہ ساری عمر بھاگتی رہی ہو اور اب شعلوں کے قرب سے اسے ٹھنڈک کا احساس ہو رہا ہو۔ بہت دیر دونوں چپ رہے۔ فلک اپنے ستاروں سمیت جیسے ان کے سروں پر گر گیا

اس نے چلمن کی طرف ہاتھ بڑھایا اور احسن القصص اسے دیدی۔ " سورۃ یوسف قرآن پاک میں بہترین کہانی ہے۔ اس نے وہ مناجاتیں دیکھیں اور پھر وجد میں آئے ہوئے انسان کی طرح پڑھنے لگی۔

من وشق آن مہ خوبرو کہ چو زد صلای بلیٰ بُرد
بہ نشاط و قہقہہ شد فرد کہ انا الشہید بہ کربلا

ہاں وہ خوبرو جو خوابوں میں کبھی دکھائی نہیں دیا جو ہمیشہ اوٹ میں رہا جو سراپردۂ اسرار میں پوشیدہ تھا وہ ظاہر ہو گیا۔ ہاں دنیا پھر دیارِ عشق تھی اور روح روزِ ازل سے " الست بربکم " کہتے ہوئے اس منزل تک آئی تھی کہ اپنے رب کا نظارہ کر سکے۔

اے لوگو اٹھو اور دیکھو۔ اے لوگو جاگو اور حیران ہو۔ وہ جس کا تجسس صدیوں سے تھا آن پہنچا

وہ دنیا کو غم سے نجات دے گا"

بے عمل قومیں بے نصیب قومیں ہمیشہ ایسے مسیحا کی تلاش میں رہتی ہیں جو ان کے درد کا مداوا کر سکے وہ خارجی محاکات و اشارات کی منتظر ہوتی ہیں انہیں اپنے اندر اتر نے اور اپنی اصلاح کرنے کی کبھی نہیں سوجھتی۔ وہ کسی ایسے فردِ واحد کی تلاش میں رہتی ہیں جو ان کا رب بننے کی صلاحیت رکھے۔ ان کے مسائل کو حل کر سکے۔ وہ حکم دے سکے اور وہ ساری مسیح کی بھیڑیں بن کر اس کا حکم مانیں اسے سجدہ کریں۔ سوئی ہوئی قومیں صورِ اسرافیل کی منتظر رہتی ہیں۔ ایک ایسے آدمی کی آواز سننے کے لیے جو انہیں جگا سکے۔ ہنکا سکے ان کے ذہنوں کو اپنی تجلّی سے جلا دے۔ اور ان مخالف قوتوں پر صاعقۂ قہر بلا بن کر گرے۔ خواب دیکھنے والی قومیں اس طرح کبھی کبھار راہ سے بھٹک جاتی ہیں۔ ہر راہبر کے عقب میں چل پڑتی ہیں۔ یہ نہیں کہ پہلے مذہبوں کے پاس دوا نہیں ہوتی مگر ہاتھ پاؤں چھوڑ کر بیٹھ رہنے والے لوگ مجاہدے اور ریاضت کے راستے سجدوں میں گر کر وہ سب کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں جو انہیں بزورِ شمشیر حاصل ہو سکتا ہے۔ قومیں صفحۂ ہستی سے ناپید ہوئیں اور ان پر ان کی بستیاں الٹائی گئیں۔ طوفان بھیجے گئے۔ زمین و آسمان میں کہیں امان کی جگہ نہ ملی۔ خود خوارزم شاہی سلطنت تباہ ہوئی اور یاجوج ماجوج کی قوم نے مشرق سے نکل کر ساری بادشاہتوں کو الٹ دیا۔ بغداد ایک قصہ داستان بن گیا۔ کیا یہ عبرت کافی نہیں۔ سپین مٹا۔ مسجدیں مرثیہ خوانی کو باقی رہ گئیں۔ مگر اولادِ آدم کسی دوسرے کے قصے سے سبق نہیں سیکھتی۔ سب کچھ اس پر بیتنا چاہیے۔ اس پر خود گذرنا چاہیے۔ ہر زمانے کے عبرت کے سبق اس کے خود اپنے پیدا کردہ ہونا چاہئیں۔

عشقِ بلا خیز کی یہ ایک نئی داستان تھی جسے لکھنے کے لئے وہ قزوین کو خیرباد کہہ آئی تھی۔

شجرِ طوبیٰ کا وہ پتہ۔ درختِ طور۔ شیراز قریہ طور تھا۔ یہ وہ آستانہ تھا جہاں موسیٰ نے نہایت گڑگڑا کر کہا تھا کہ وہ جلوہ دیکھنا چاہتا ہے اور خداوندا سے وہاں نظر آیا۔ جیسے ابراہام کو خدا ممیرؔں کے جھنڈ میں نظر آیا تھا۔ یہ ایک لفظ تھا جس کا عرفان اسے حاصل ہونے والا تھا۔ وہ زمانوں کی رو میں بہنے والی کشتی کی طرح جس میں نہ دن ہو اور نہ رات فنا سے پرے تک بہتی چلی جائے گی کربلا میں اس کے درو میں شریک ہونے کے لئے لوگ دور دور سے آنے لگے اور اس کی مخالفت بھی اس شدت سے ہونے لگی۔ بھلا ملا اور مجتہد یہ سب کیسے برداشت کرتے۔ وہ سب زمانوں سے امام غائب کے لیے چشم شوق وا کئے ہوئے تھے۔ سید الشہدا اپنے لشکریوں سمیت یزید اپنے حواریوں کے ساتھ وہی شمر اور وہی آلِ نبی کے خیمے پوری زندگی اسی ترتیب سے واپس

آئے گی تاکہ حسین ابن علی اپنے دشمنوں سے بدلہ لے سکیں۔ اور یہ ار باب" ایک جادوگر کی طرح ظاہر ہوا تھا جس نے سب الٹ کر رکھ دیا تھا۔ مسجدوں میں منبروں پر مجتہدوں کے خطبوں میں وہ زوری نہیں رہا تھا۔ فضا میں ایک تناؤ تھا۔ وہ نور کے تخت اور نوے ہزار نور کے قبے اور آسمانوں سے بھیجے امام حسین کے لئے جنت سے خوان لاتے۔ فرشتوں کے انبوہ یہ سب بیان کرتے ہوئے اب وہ ذرا تھم جاتے تھے رکتے تھے اور قرۃ العین کے دلائل کی روشنی میں عقل استعمال کرنے لگے تھے۔

صفویوں نے جو مذہب دو سو سال کی ریاضتوں سے پھیلایا تھا۔ جس کی جڑیں سرزمین ایران میں گہری کی تھیں اس کو ایک عورت کی زبان کی باتیں کیا ہلا دیں گی۔ اس کے گرد مجمع بڑھنے لگا تھا۔ وہ دلربا تھی اور اسے یہ زیب دیتا تھا کہ حکم دے اپنے جلال و جمال کو منوا کرے۔ اس کے لئے وہ تیار تھی کہ وہ داستان رنگین ہونی چاہیئے۔ چاہے اس میں اس کا اپنا خون ہی کیوں نہ شامل ہو۔ اس جوشِ جنون میں ایک فرزانگی تھی جو سوچ سمجھ اور ترتیب کو بھی شکست دیتی ہوئی تھی۔ وہ شاعرہ جو اپنے شعروں سے مشرق و مغرب کے ایوانوں میں آگ لگا سکتی تھی۔ اس نے اپنی شاعری اور زورِ بیان، اندازِ فکر اور حسن احساس کو ایک نئے طور پر ڈھالا پیغمبری سے بھی آگے۔ معراج میں تو رسولِ پاک افلاک کی سیر کر آئے تھے۔ وہ اپنے محبوب کو اس سے بھی پرے دیکھنے کی خواہشمند تھی۔ مسند جو جانے کب سے سنبھالے بیٹھا تھا اور جانے کتنی دنیائیں اور حدِ ادراک سے بھی پرے ہمیشہ نئے نئے تماشوں میں لگا رہتا تھا اسے اب اپنے انوار اور اپنے تماشے کسی اور کو سونپ دینا چاہئیں۔ انسان کو پیدا کر کے جب اس نے اپنا نکتہ چیں پیدا کیا تھا تو اپنی سلطنت بھی سونپ دے۔ افلاک کے ایوانوں میں زلزلہ آ گیا ہو گا۔ آ ہی جانا چاہیئے۔

اس کا محبوب ایک قادر الکلام شاعر تھا۔ سب پیغمبروں کو معجزات دیئے گئے ہیں موسیٰؑ کو عصا اور یدِ بیضا تاکہ وہ جادوگری کا مقابلہ جادوگری سے کر سکے۔ اگر وہ فرعون کے دربار میں سانپ پھینکیں تو اس کا عصا ایک پھنکار سے ان کو ہڑپ کر سکے۔ حضرت عیسیٰؑ کاہنوں کے زمانے میں سب سے بڑے کاہن تھے وہ مردوں کو زندہ کر دیتے تھے۔ مسیحا نفس حضرت رسولِ خدا محمدؐ بن عبداللہ کو عرب جیسی قادر الکلام قوم کے لئے قرآن کا اعجاز بخشا گیا تھا اور علی محمد باب کو شاعری کا جوہر وہ اس بات پر قادر تھا کہ کم از کم وقت میں زیادہ شعر بنا سکے اور یہ کافی تھا مگر اس کو تو سب رسولوں کا جامع حسنات ہونا چاہیئے۔ ہاں "باب" کو سارے نبیوں کے معجزات پر قدرتِ کاملہ حاصل ہونی چاہیئے۔ وہ رب تھا اور خداؤں کا ایک گروہ اس کے گرد جمع ہو رہا تھا

باب الباب - قدوس - جناب قائم اور جناب طاہرہ - وہ سب اس شجر حقیقت کے پتے تھے باب نکتہ تھا اور وہ سب اس نکتے کے گرد جو نکتۂ پرکار حق تھا اس یقین کے ساتھ کہ وہ موجودات کے وجود کا نکتہ ہے - گھومتے تھے - عزازیل اپنے علم کی وجہ سے راندۂ درگاہ خداوندی تھا - اہرمن یزداں کے سامنے ایک عظیم طاقت دوسری عظیم طاقت کے مقابلے میں - وہ اپنے قوسِ وجود کے صعود و تنزل کی ساری صعوبتوں سے آگاہ تھا آئینہ جس میں وہ سب نظر آتا ہے - جسے دیکھنے کی آرزو آدمی کو بےچین رکھتی ہے - باب پر جو کلام نازل تھا وہ اتنا تھا کہ باقی سارے کلام اس کے سامنے (نعوذ باللہ) گرد تھے - وہ صاحب مسجد و محراب و منبر تھا -

کتابوں میں لکھا تھا کہ مہدی موعود بیت اللہ سے ظاہر ہوں گے اس لئے علی محمد جو باب تھا شیراز سے سمندر کے راستے اپنے سفر کعبہ پر روانہ ہوا تاکہ کتابوں اور آئمہ کی حدیثوں کو سچا ثابت کر سکے - وہ اپنے وجود کے لئے دلیل کی تلاش میں تھا اور دلیل زمانے کی نظروں میں صرف اسی سرزمین سے مل سکتی تھی اس کے خون کو پاک ترین خون ہونا چاہئیے منجسب تر اور اس لئے اس کی نسبت آلِ رسول سے ہی تھی - وہ حسین ؓ ابن علی کی سی فراست حسن کا مالک ہو علی محمد باب پر اپنی جوانی اپنی ساری دیوانگیوں سمیت آئی تھی - روشن خوابوں والا یہ جوانِ رعنا جس آبشار کے تیز پانیوں میں اپنی کشتی کھے رہا تھا - اس کا انجام اسے معلوم تھا -

بزلفِ تو ساقی چو دل بستہ ام ٭ زقید دو عالم ہمہ رستہ ام

لوگوں نے حافظ کے نغموں میں زندگی اور زندگی کے مصائب کا حل تلاش کیا تھا - سعدی کے اشعار میں حکمت و حکایت تھی - مرد شہدا کو مئے عشق اور جام شراب کا تقاضا جائز تھا - مگر ایسے میں ایک عورت کا کلام یار کی تجلی سے پُر زلف ساقی کے افسانوں سے دلآویز حیران کن تھا نئی شریعت جس کو باب "لایا تھا اپنی نادر تلمیحات اور قرآن پاک کی تاویلوں سے اپنے فلسفوں اور اپنے انوار کے ذکر سے ان کے لئے مکمل تھی - حضرت یوسف ؑ کے حسن کے قصّے افلاک اور نجوم و کواکب کا ذکر - روشنیوں اور تذکروں کے نور سے پر درختوں اور بتوں پاکیزگیوں سے اسے پُراسرار بنا یا گیا تھا - سارے لوگ ناپاک تھے - صرف باب کے پیروکار پاک تھے - قرۃ العین نے کربلا میں علین سید الشہداء کے مقبرے کے سائے میں کہا -

" تم لوگ پاک ہو - باقی ساری خلقت ناپاک ہے "

یکایک ایک دیوانے کی آواز نے ہلچل مچا دی تھی - لوگ مسجد کی طرف دوڑے -

میری نظر جس شے پر پڑے گی وہ پاک ہو جائے گی۔ کیونکہ "باب" نے جو ایک نئی اور مکمل شریعت لے کر آیا ہے مجھے طاہرہ کہا ہے۔

اے جانِ خوبی تو بیشک طاہرہ ہے۔ شریعت کے اسرار جاننے والی۔ فقیہہ شہر نے خود اس کے درس میں شرکت کی۔

پردے کے پیچھے سے ایک نہایت پر کیف آواز آئی۔

"تم اپنا جامۂ امامت اتار دو کلاہ فخر کو جھکاؤ کہ میں اپنی نظر سے تمہیں پاک کر سکتی ہوں۔"

بے چین لوگ پریشان ہو کر واپس ہوئے پوری زندگی جیسے معطل ہو گئی ہو۔ وہ صورِ اسرافیل بن گئی تھی۔ "میری آواز صورِ اسرافیل ہے قیامت آ گئی ہے بھاگو اور ایمان لے آؤ"

ملا مشاورت کے لئے جمع ہوئے اور انہوں نے "باب" کے ماننے والوں کو بلایا۔

ملا حسین بشروئی۔ میرزا احمد آفندی۔ میرزا صادق مقدس۔ شیخ ابو تراب اشتہاردی، ملا یوسف اردبیلی۔ ملا جلیل اورومی۔ ملا مہدی کندی۔ شیخ سعید ہندی۔ ملا علی بسطامی۔ قرۃ العین سے ملاقات پھر کسی موقع کے لئے اٹھا رکھی گئی۔

شیرازی جوان جو صرف اپنی عبادات کی وجہ سے اہم تھا کیا ان پر جادو کر دیا گیا ہے؟ ہر طرف سے سوال ہو رہے تھے۔ ملا حسین بشروئی نے نہایت عاجزی سے مجتہدوں کے سامنے کی زمین چومی اور جو دیکھا تھا بیان کیا وہ فقیہانِ شہر تھے اور چاہتے تھے کہ سمجھیں مگر وہ "باب" کے رب ہونے کو کیا سمجھتے۔ رسولِ خدا کے بعد ہدایت مکمل ہو چکی تھی دین مکمل ہو چکا تھا۔

ہمارا رب پاک ہے اور باقی دنیا ناپاک۔ یہ عجیب دیوانگی کا دعویٰ تھا جس کا نہ کوئی ثبوت تھا اور نہ ہی کوئی دلیل۔ وہ ہوا میں کھڑا مناجاتیں کرتا تھا اور انہیں جو اسے ماننے کے لئے تیار تھے عام زندگی میں آگ پر چلنے رہا تھا۔ فدائین کی طرح وہ ان سے نامختتم قربانیاں چاہتا اور ان کی جان کا سودا کر رہا تھا وہ سب جو اس کو ماننے والے تھے۔ گمراہ ہو گئے تھے اس عورت کو جسے وہ باب کی تقلید میں طاہرہ کہتے تھے۔ فصاحت کی کوئی خوبی دی گئی تھی وہ اسلام کے قلعے میں بیٹھ کر مذہب کی دھجیاں بکھیر رہے تھے جیسے بچے بارش کے بعد پانی میں کھڑے چھینٹے اڑا کر اپنے کو اور راہگیروں کو بھگوئیں طاہرہ کو مباحث میں الجھانے کی بجائے انہوں نے کہا کہ وہ بغداد چلی جائے۔ اپنی اس بھیڑ کے ساتھ جس میں جوان لڑکیاں مائیں بہنیں ناآسودہ خواتین تھیں۔ جن کی پریشانیوں کا واحد علاج مذہب

تھا۔ وہ بغداد کے لئے تیار ہوئی۔ وہ اپنے حسن اور حسن بیان کی وجہ سے اپنے آپ کو دُر بے بہا سمجھتی تھی اسے شعروں میں چھپی اس آگ سے اندازہ تھا کہ وہ دنیا کو جلانے کا حوصلہ رکھتی ہے اسے اپنی اداؤں پر بھروسہ تھا۔

سواریاں دروازے پر لگ چکی تھیں۔ کاظم رشتی کے رشتہ دار حوض کے گرد جمع تھے۔ ہوا بادلوں میں گھلی ہوئی تھی اور پتوں کو کم کم جنبش دیتی ہوئی چلتی تھی۔ کتب خانے سے طاہرہ کی مناجاتیں پڑھنے کی آواز آرہی تھی سب خاموش تھے ایک عجب اداسی سارے میں پھیل چکی تھی جس کو یہ دمِ رخصت کی دعائیں اور بھی پراثر بنا رہی تھیں۔ زرد گولے شاخوں میں اٹکے ہوئے تھے۔ حوض میں آسمان کی زردی کا عکس پڑ رہا تھا۔ آہستہ تیرتے ہوئے بادلوں کو جھولا جھلاتا ہوا صاحب خانہ ایک معمر خاتون تھی۔ جس کی سفید بھنویں اس کی آنکھوں پر جھکی ہوئی تھیں۔ سیاہ لبادے پر سیاہ ریشمی ٹوپی پہنے جس کا دوپٹہ بھی سیاہ تھا یہ کاظم رشتی کی بیوی تھی۔ صفویوں کی اولاد میں سے ہونے کی وجہ سے اس میں ایک شکوہ تھا جو بیتی شوکتوں پر دلالت کرتا تھا۔ تین سال سے وہ بہت حوصلے سے اس دیارِ غیر میں اپنے ساتھی کا غم برداشت کر رہی تھی۔ پھر قرۃ العین آکر اس کے غم میں شامل ہوئی تھی وہ جواب دربابؔ کی طاہرہ تھی اس کا حرف حرف۔ کتب خانے کے نادر رضا نے کو ان کی اولادیں بیکار جانتی تھیں۔ وہ سب انگریزوں اور فرانسیسیوں کی غلامی کو پسند کرتے تھے اور ان کا ذہنی ملک یورپ تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ایران کے دن گنے جا چکے ہیں اور اب اس کی نجات کا واحد آسرا سیاسی تبدیلیاں اور اقتصادی بدحالی کے لئے کوئی انقلابی لائحہ عمل تھا۔ وہ قاچاریوں کے دربار میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے مگر ان کے آسرے دوسرے تھے۔ وہ کئی پراسرار واسطوں سے اپنی جگہوں پر آئے تھے اور ان کے آقا بھی پوشیدہ تھے۔ سید کاظم رشتی کے بیٹے سدا سفر میں رہتے تھے اور انہیں وہ سب کتابیں پڑھنے اور ان کے مطالب سمجھنے اور غور و خوض کرنے کا شوق نہ تھا اور نہ فرصت میں وہ سیاست کے الجھاوؤں کو دوسری تعلیمات سے سمجھنا چاہتے تھے۔ رشت اور موسیٰ کاظم کے مقبرے کے قریب ان کا آبائی گھر ان کی والدہ کو از بر وہ پرانی داستانیں سب کوہ البرز کے اندر رہنے والے دیو کے قصے تھے جھوٹی تسلیاں بھلا صفویوں میں سے ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ طاقت پر قبضہ کرنا۔ اقتدار حاصل کرنا ان کی زندگی تھی قائم آلِ محمد کے آنے اور نہ آنے سے ان کی نسل کا کوئی واسطہ نہ تھا۔ خدا کی بادشاہت کے وہ قائل ہی نہ تھے۔ خدا تو آسمانوں میں تھا اور آدمی کو اپنے اور اپنے ملک کے معاشی حالات سدھارنے کے لئے ملاؤں کی ایک اور جماعت کی ضرورت نہ تھی۔ وہ تو ملاؤں اور مجتہدوں سے اپنے ملک کو آزاد کروانا

چاہتے تھے۔ فسانوں کی سی باتیں اور سننے کے لئے وہ وقت کہاں سے لاتے۔ خدا ان کی زندگیوں میں بس یہاں تک دخیل تھا کہ اس نے انہیں پیدا کیا تھا۔ باقی وہ خود بڑھ رہے تھے اور سوچتے تھے پھر اسلام جس طرح سے وہ ایران میں تھا کافی تھا۔ ایک نئے مذہب کی کیا ضرورت؟ مہدی موعود کی امام غائب کی رجعت حسین کی۔

"طاہرہ تم جدا ہو رہی ہو دختر م اور پھر ملاقات ہوتی نظر نہیں آتی"

اس نے چاروں طرف دیکھا یہ گھر جس نے اسے آسرا دیا اور قبول کیا تھا وہ ان کے درمیان اپنوں کی طرح رہی تھی اس نے ان کی ساری محبت پر غاصبانہ قبضہ کیا تھا اور اب ایک نامعلوم مستقبل ایک ان دیکھا راستہ ان کے سامنے تھا۔ ملا صالح کی صاحبزادی ہونے کی وجہ سے اس کے ساتھ بہت رعایت برتی گئی تھی۔ اس کی سرشاری اس کی دیوانگی وہ سارا جوش و خروش قابل گرفت نہیں سمجھا گیا تین سال تک اس نے سید کاظم رشتی کی درسگاہ میں لوگوں سے مباحثے کئے تھے۔ حق کی تلاش میں رہنے والوں کے ساتھ مل کر اس نئے پیغام کو عام کیا تھا۔ جان دینے کا جذبہ شدت اختیار کر گیا تھا۔ اس کی شہرت اس سے پہلے ہر جگہ سفر کر چکی تھی۔ قافلوں کے سالار اور شاہراہوں پر ادھر ادھر جانے والے نجف اشرف میں جمع ہونے والے سید الشہداء کا ماتم کرنے کربلا میں آنے والے سب "باب" کو لقا اللہ جاننے والوں سے خائف تھے۔

محمد علی بار فروش نے جو جناب قدوس تھا۔ محمل کا پردہ پکڑ کر کہا تھا۔ طاہرہ ہر آدمی کے اندر ایک خدا ہے۔ ہر آدمی خدا ہے۔ ہر آدمی "باب" ہے۔ ہر آدمی کا چہرہ لقا اللہ ہے۔ کیونکہ وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ" اور بہترین صورت سوائے اس کے کس کی ہے" وہ ایک جوان رعنا تھا "باب" کا پرجوش مومن۔ وہ "باب" کے ساتھ بہت دور نکل آیا تھا اس سے آگے چلا گیا تھا۔ "کیا وہ ایمان والوں کی طرح سوچتا تھا؟"

کربلا کے شب و روز اچھے تھے گزر گئے مگر بہرحال اسے آگے جانا تھا ہاں اسے آگے جانا تھا ہر مقام سے آگے۔ اونٹ بلبلا رہے تھے اور لوگ بے آواز رو رہے تھے جیسے وہ اس کے بعد بے سہارا ہو جائیں گے۔ "باب" بیت اللہ سے واپس آ رہا تھا کہ بوشہر میں اسے گرفتار کر لیا گیا۔ حکومت کا خیال تھا کہ فتنے کو پھیلنے سے روکنا ہی چاہیے اور اسے بھی کربلا چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا۔ کرب و بلا کی بدعہدی کی اور خونِ ناحق کی ارزانی کی سرزمین ہو دے میں وہ اکیلی تھی اور پتہ نہیں کیوں اسے محمد علی بار فروش کے انکشافات یاد آ رہے تھے۔ خدا کا چہرہ دیکھنے کی

آرزو جانے کیوں شدید سے شدید تر ہوتی جارہی تھی جیسے وہ جانِ آرزو ہو۔ پتہ نہیں وہ کب ملے گا وہ ماکو میں قید تھا اور روز بروز دور ہوتا جارہا تھا ۔ اس کی رسائی کیوں اس تک نہ تھی وہ کربلا میں تھا تو وہ قزوین میں تھی وہ قزوین سے کربلا آئی تو وہ شیراز میں تھا۔ وہ کربلا اس امید میں ٹھہری رہی کہ شاید ملاقات ہو سکے مگر وہ ماکو میں تھا کتنے لوگ روزانہ سے دیکھتے تھے اس سے ملتے تھے اس سے بحث کرتے تھے صرف وہ پیاسی تھی کیا وہ سرابوں کے پیچھے بھاگ رہی تھی ؟

کوچہ بہ کوچہ کو بہ کو

دجلہ کے کنارے جہاں پانی پر دولت عباسیہ کا عکس ابھی کانپتا ہے وہاں کہیں وہ بھی اپنے ہودے سے اتری کہ اپنا رخ زیبا اس آئینے میں دیکھے آواز کی بازگشت صدیوں بعد سننے کے لئے اس نے اپنے "باب" کی نئی شریعت کا اعلان کیا جیسے پیاسے کنوئیں کے پاس آتے ہیں۔ اس کے گرد جمگھٹا رہتا۔ شاید مقدر یہی تھا کہ وہ ساقی تو ہو مگر اس کی پیاس ہمیشہ کے روزے کی طرح اس پر مسلط کر دی گئی ہو وہ اس کا قبلہ و کعبہ تھا اس کی نجات کا ذریعہ وہ طالب تھی اس کے دیدار کی اور قضا و قدر نے اسے مجسم پیاس بنایا تھا۔ العطش پکارتی رہی اس کی آنکھیں اس کے ہونٹ اس کا رواں رواں اس کا دل ۔ وہ ہمیشہ جاں کنی کی حالت میں سفر کرتی رہی اور سرابوں کے پیچھے بھاگتی رہی۔ کربلا سے بغداد۔ قزوین سے کربلا اور نہ جانے کب تک مسلسل سفر میں کائنات کے ذروں کے اندر دھڑکتے دل کی طرح ۔ بغداد کے متعلق مختلف روائتیں ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ سمندروں کی دیوی نے جادو کی چھڑی سے حسین و جمیل شہر کو دجلہ سے نکال کر اس کے بائیں کنارے پر کھڑا کر دیا۔ نوشیرواں کا یہ گرمائی صدر مقام جہاں وہ دربارِ عام لگا کر انصاف کیا کرتا تھا۔ پھر اس کی اجڑی ہوئی حالت کو خلیفہ منصور نے بدلنا چاہا اور ماہرین تعمیر نے یہ الف لیلوی شہر تعمیر کیا خلیفہ نے اپنے ہاتھ سے سنگ بنیاد رکھا اور دائیں کنارے پر "مہدیہ" بسایا گیا حسن اور آرٹ کا دلفریب نمونہ یہ شہر پانچ صدیوں بعد خلیفہ معتصم باللہ کے عہد میں ہلاکو کے ہاتھوں برباد کیا گیا۔ اونچے برجوں، فصیلوں اور دروازوں نے پاسبانی کے فرائض انجام نہ دیئے۔ مغل اندر گھس آئے ۔ اس کا سارا مال و اسباب لوٹ لیا۔ نوے ہزار مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔ پھر کبھی بغداد کو عالم اسلام کا مرکز بننا نصیب نہ ہوا اور یہ اس لئے ہوا کہ خلیفہ نے خوارزمیوں اور سلجوقیوں کے حشر سے کبھی عبرت حاصل نہ کی ۔

اسی بغداد میں ملا محمد کی "عروس" نے ورود کیا۔ وہ ان الف لیلوی محلات میں رہنے والی شہزادیوں کی طرح کنیزوں کے جھرمٹ میں تو نہیں ۔ مگر شاگردوں کے مجمعوں میں نزول اجلال کرتی ۔ ان جلوہ گاہوں میں

جہاں کبھی ملکہ بوران بیٹھتی تھی وہ بھی جلوہ افروز ہوتی۔ یہ وہ شہر تھا جہاں کی مستورات اپنے گھروں میں علمی جلسے اور مجلسیں بپا کیا کرتی تھیں۔ ظرافت اور علمیت میں مردوں کے پہلو بہ پہلو تھیں۔ یہیں پر عبدہ خاتون بھی جو نیک نہاد لائق اور پارسا عورت تھی اور طنبورہ غضب کا بجاتی تھی پھر شہنہ جو خوش خطی میں طاق تھی۔ زینب ام الموید جس کو علم فقہ پر عبور حاصل تھا۔ اور جب گیارھویں صدی میں تمدنی اور سیاسی ایوان پر اداسی چھا گئی۔ تب بھی عورتوں کی عزت کی جاتی تھی۔ اس شہر پر سے آفتابوں اور ماہتابوں کے جلوس گزر رہے تھے۔ ستارے اس کی راہوں پر نثار ہوئے تھے اور دنیا چل کر یہاں آیا کرتی تھی کہ خلیفہ علوم کا قدر دان تھا۔ اب زمانے اور تھے اور قرۃ العین کو نہایت عزت و احترام مگر خوف کے ملے جلے تاثرات سے خوش آمدید کہا جاتا تھا۔ وہ ایک ایسے مذہب کو لے کر آئی تھی۔ جو ابھی بن رہا تھا۔ جس کے اصول قوانین تعین نہیں ہوئے تھے اور جو علمی مباحث کی مجلسوں میں تو خوب چل سکتا تھا مگر دنیا کے لئے اس میں کوئی کشش نہیں تھی۔

علما جامعہ رصافہ میں جمع ہوئے اور مباحث کا آغاز ہوا۔ قیامت کیا ہے انہوں نے سوال کیا۔

حضرت موسیٰؑ کا آنا حضرت یوسفؑ کی شریعت کے لئے قیامت تھا۔ حضرت عیسےٰؑ حضرت موسیٰؑ کے لئے قیامت بن کر آئے۔ حضرت رسول مقبولؐ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کے لئے قیامت ثابت ہوئے۔

علما نے حیران ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

پھر انہوں نے معراج اور رجعت اور ایسے بہت سے مسائل پر گفتگو کی اور انہوں نے اسے کسی جگہ بھی جواب دینے پر عاجز نہ پایا۔ یوں بھی وہ ملا صالح کی صاحبزادی تھی علم جس کے گھر کا غلام تھا۔ یہ تادلیں اس نے شیخ احمد احسائی اور سید کاظم رشتی کی تعلیمات سے اخذ کی تھیں وہ باب پر ایمان لائی تھی۔ باب جس کو وہ ماکو سے تبریز لائے تھے کہ علما کی ایک جماعت اس کا امتحان لے۔ مفتی اعظم کے گھر اس نے روزے رکھے اور سخت ریاضتوں میں اپنے کو گھلایا۔ "باب" کی کامیابی کے لئے دعائیں کرتے کرتے اس کی زبان گنگ ہو جاتی اور جی الٹنے لگتا۔ وہ ماکو کی طرف منہ کر کے مناجاتیں پڑھتی اور مراقبے میں دم سادھے ہوئے مدہوش رہتی۔ شیخ ہندی نے اس کے ہندو مت کی جو کتابیں دی تھیں اس میں نہایت عجیب و غریب تجربات سے آدمی اپنے پر قابو حاصل کرتا تھا۔ نروان اور شکتی کے حصول کے لئے دعائیں اور منتر تھے۔ بدھ نے سلطنت کو چھوڑ کر جنگلوں میں جگہ بنائی تھی اور اس کی ذات کی روشنی اقصائے عالم میں پھیلی تھی۔ یورتوں میں رہنے والے دنیا کو

ہلاکت کا تحفہ دینے والے پہاڑی راستوں میں منہ زور جھاگ اڑاتے دریاؤں کی طرح کے خانہ بدوش اس کی تعلیمات سے سرشار ہوئے تھے۔ اس کے دل میں مناجاتیں تھیں۔ اس کا مرشد ہادی کار اہبر جو اس کا محبوب اس کے رویا کا پوشیدہ چہرہ تھا۔ اس کے لئے راہ نجات بنے۔ سارے ہادیوں کی ذاتوں کا نقطۂ بابرکت۔ آئینہ تمثال دار"۔ طاہرہ تم نیکی اور دین مبین کی خدمت میں اپنے آپ کو گھلا رہی ہو۔ مفتی اعظم نے کہا وہ اپنے گھر کے اس حصے سے جس میں گورنر کے حکم سے اسے ٹھہرایا گیا تھا۔ بہت کم کوئی آواز سنتا تھا۔ عورتیں خاموشی سے آتیں اور دعا کی طالب ہوتیں۔ وہ چمکتا ہوا چہرہ سیاہ نقاب میں چھپائے رہتی محمد علی بارفروش کی بات اسے یاد رہتی۔ اس شک سے بچنے کے لئے وہ جیسے جھک جاتی مگر ضحاک کے کندھوں پر اُگے سانپوں کی طرح وہ پھر سر اٹھاتے شکوک و شبہات اور علم کے زور سے حاصل کی ہوئی صداقت اور صداقتوں سے اخذ کئے ہوئے نتائج۔ اس نتائج پر زندگی کے راستے جو اس نے اپنے لئے چنے تھے۔ محمد علی بارفروش کا چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوم جاتا۔ وہ پردے سے لگا کھڑا مباحث میں نہایت ہوشیار ہونے کے باوجود بات کرتے ہوئے گھبرایا ہوا نرم لہجے میں گفتگو کرتا ہوا۔ اس کا دل ایک دفعہ اور دھڑکنا بھول جاتا وہ اپنی ریاضتوں میں غلو کرنے لگی تھی۔

بھلا وہ کون تھا۔ جو لقاء اللہ سے متعلق یہ شک اس کے جی میں ڈال گیا تھا۔ قیامت کے روز خدا اپنے بندوں پر ظاہر ہوگا۔ تمام بندوں سے کلام کرتا اور تمام کا حساب لے گا۔ جو شہید ہوں گے انہیں سعادت کے مرتبے پر اور جو شقی ہوں گے انہیں شقاوت کے مرتبے پر اور وہ اپنے آپ کو ملزم گردانیں گے۔ لقاء اللہ کا مطلب ظہورِ جمال حجت عصر ہے کیونکہ اس کا جمال اللہ کا جمال۔ اس کا لقا اللہ کا تھا۔ اس کا کلام اللہ کا کلام اس کا ظہور خدا کا ظہور اس کا دن اللہ کا دن مگر اگر وہ خدا ہے جس سے اس کی ملاقات نہیں ہوسکی۔ تو پھر اس بے چینی کے لئے یہی سزا ہوگی۔ وہ حضرت کی رضا سے جنت میں داخل ہونے کے لئے تیار تو تھی مگر حضرت کی رضا کیا تھی؟

محمد علی بارفروش نے تو حضرت کو دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں نے ان آنکھوں کا نظارہ کیا تھا کیا ہوا اگر "باب" تبریز میں ملاؤں کے سامنے خاموش ہو گیا تھا۔ اس نے ان سے معافی چاہی تھی اس نے اپنے امر اللہ ہونے سے انکار کیا تھا۔ یہ وقت کی مصلحت کا تقاضا تھا مگر کیا خدا مصلحت پسند ہوسکتا ہے؟ اس کے خون میں عطا کئے گئے ورثے رگوں میں ایک دوسرے سے دست و گریبان تھے کیا وہ خدا نہیں تھا؟ کیا ان پر قیامت گذر نہیں چکی تھی۔ وہ جو کل عقل کا مالک

تھا کیوں خاموش ہو گیا اور وہ جو سرشاری کی کیفیت میں تھی دیوانگی سے یہاں وہاں گھوم رہی تھی وہ کیا کر رہی تھی۔ قائم آلِ محمد کے لیے محبت تو تھی مگر قائم کیوں اتنا عاجز تھا۔ اس علم اور معجزات کا ظہور کیوں رک گیا تھا؟ ایک انفی اس کے دل میں سر اٹھا رہا تھا۔

وہ بے آسرا گروہ اب کس کے آسرے رہے گا؟

مفتی کے گھر سے باہر شیخ محمد شبل نے سواری کے لئے خچروں کا انتظام کر رکھا تھا وہ بغداد سے نہایت عزت و تکریم کے ساتھ رخصت کی جا رہی تھی۔ ترکی کے سلطان کے حکم سے اسے حفاظت اور احترام سے سرحدِ ایران تک پہنچایا جانا تھا۔ رات چاند اور ستاروں سے مزین نہایت بانکپن آسمانوں میں نکلی۔ عرب شیخ کا بیٹا محمد مصطفےٰ۔ شیخ صالح کریمی، شیخ سلطان کربلائی درویش ماکوئی جاوید۔ حسین ہلاوی اس کے ساتھ تھے۔ وہ کرمانشاہ کی طرف جا رہے تھے۔ راہ کی بستیوں سے لوگ اس عجیب و غریب قافلے کو دیکھنے کے لئے نکلتے۔ جس کی سالار ایک عورت تھی۔ نقاب پہنے ہوئے خیالوں میں گم۔ جب کوئی بھیڑ جمع ہو جاتی انہیں سستانا ہوتا۔ ہوا گرم ہو جاتی کسی اور کو پانی کی ضرورت ہوتی تو سارا قافلہ رک جاتا وہ کس منزل کی طرف رواں تھے؟ وہ خدا کی ذات میں اپنے کو فنا کر دینا چاہتی تھی مگر وہ منزل آ ہی نہیں چکتی تھی۔ وہ مقام جس سے پرے کچھ نہیں جیسے قطرہ دریا میں مل جائے اور دریا سمندر میں گرتے ہوئے اس قطرے کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے مناجاتوں میں وہ طاقت کیوں نہیں تھی کہ وہ مراقبے میں سب کچھ بھول جائے اپنا آپ یا جو بھی اس کے وجود کے اور کل کے درمیان حائل تھا وہ حروف حیؔ تھی مگر اس حرف کے الگ معنوں سے وہ خائف تھی وہ ساری سعادتیں جو اس کی حرماں نصیبی کی پیداوار تھیں اسے کیوں یاد تھیں۔ اور حرماں نصیبی سے بچ کر وہ کس طرف نکل سکتی تھی۔ خچر پر سوار وہ سر جھکائے ہوئے اپنے سینے پر بڑھ کر بھونکتی تو اسے بدن یاد آ جاتا۔ سفید بے داغ جلد جس پر وہ کسی زمانے میں خود ہی فدا تھی۔ غازہ دل اور کئی حسن افزا چیزوں سے وہ اپنے چہروں کو سجاتی تھی۔ ایرانی غازہ تو چین تک مشہور تھا۔ میرا خدا اس ترشے ہوئے سراپے پر کیسے فدا ہو؟ وہ دل ہی دل میں اپنے آپ کو لعنت ملامت کرتی مناجاتیں اور دعائیں اور زور زور سے پڑھتی۔ احسن القصص کے عربی اشعار اسے ازبر تھے مگر اس کا دل کہیں اور ہوتا اور زبان اشعار کو دہراتی۔

اس شخص نے خواب دیکھے تھے خواب سچے تھے۔

ان کی نظر سے مراد ان کا ارادہ ہے۔ ان کا ارادہ اللہ کا ارادہ ہے۔ حلال و حرام کا حکم

اللہ کے ارادے سے ہے۔

اس کے ارادوں کا اب کیا ہوگا؟ وہ سارے قصے جن کو وہ بچپن سے سنتی آئی تھی اسے بھول چکے تھے۔ اس نے ظہورِ آلِ محمد اور امر کے قائم ہونے کے ساتھ ایک بار پھر پیدا ہونے تک کا ہنگام دیکھا تھا مگر اسے اپنا آپ اسی طرح یاد تھا۔ یہ دوبارہ پیدا ہو کر بھی ابھی تک اس پہلی یادوں میں کیوں گرفتار تھی؟ اس لئے کرمانشاہ پہنچ کر اس نے اپنے ساتھ اعلان جنگ کر دیا اور مجاہدے ریاضت میں نہایت شدید ہو گئی جیسے طوفان سے پہلے پیش بندیوں میں لگی ہوئی ہو۔

محمد علی بارفروش کا خط اس کا منتظر تھا۔ جناب "باب" کو وہ ماکو سے قلعہ چہریق لے گئے تھے اور مومنین سخت عذاب میں مبتلا تھے اس نے لکھا تھا مجھے اپنی فکر نہیں ہے مگر تم یہ ساری سختیاں جھیل نہ پاؤ گی۔ لوگ دیوانگی میں جانے کیا کر بیٹھیں اور تم موردِ الزام ٹھہرائی جاؤ۔ میں تمہاری سلامتی صحت اور تندرستی کے لئے دعاگو ہوں۔ تمہارا جلال تمہارا جمال تمہاری آماز سب برقرار رہیں تمہاری آزادی تمہاری آرزوئیں سب سراپردۂ اسرار سے مکمل ہوں۔ میں تمہارے لئے دعا کرتا ہوں دیر تک وہ خط کو ہاتھ میں لئے بیٹھی رہی۔ پتہ نہیں اس کا دل کیوں بے طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ لقاءاللہ دیکھنے سے محروم رہی تھی اس کے جلال کے سامنے وہ لاشئی تھی۔ محمد علی بارفروش اسے کیا کہنا چاہتا تھا؟

جب وہ ماکو جانے کے لئے بے چین تھی۔ پتہ نہیں اس کا مقدر کیوں اسے ہر اس راہ سے دور ہٹا دیتا تھا۔ تبریز میں علما نے حضرتِ باب کا نداق اڑایا۔ "باب" کو اپنی قدرت بیان پر ناز تھا یہ اس کا عصا اس کی خوبی اور معجزہ تھی۔ ماکو میں اس پر نازل ہوا کلام فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے کم تر تھا وہ قرآن کا جواب لایا تھا جیسا کہ کئی اور لوگوں نے کوشش کی تھی علمائے نے اسے دیوانہ سمجھا تھا۔ کیا وہ دیوانہ تھا اس توبہ نامے کی تشہیر کی گئی تھی مگر بابیوں کو اس کی صحت پر شک تھا

اگر وہ دیوانہ تھا تو طاہرہ سوال کرتی اپنے آپ سے حساب کتاب لیتی "میں کیا ہوں"

"آوارہ بے چین روح جس نے نجابت و شرافت کو ہواؤں میں اڑا دیا" مگر میں پریشان نہیں ہوں گی میں اس پر ایمان لائی ہوں وہ دیوانہ ہو یا نہ ہو میں آخر دم تک اس مذہب پر قائم رہوں گی"

اس کے گرد جمع لوگ سر جھکا کر اس کی بات سنتے تھے صرف وہ تھا "محمد علی بارفروش" جو اس کی فصاحت اس کی ہمت اور اس کی دیوانگی سے مرعوب نہیں ہوا۔ وہ کھڑا مسکراتا رہتا جیسے اس کی ٹکر کا ہو وہ زیرِ لب مناجاتیں پڑھتی اپنی طاقت کے پوشیدہ منبع سے کمک طلب کرتی "تمہاری شاعری تمہارے جذبے سب شدید ہیں مگر سب سے شدید تم خود ہو" وہ ان باتوں کا مطلب سمجھنا نہیں چاہتی تھی نہیں سمجھتی تھی

"ماکو سارا جہان نہیں ہے میں بھی قید میں ہوں"، وہ نہیں کہ کہتا۔

جوانی دیوانی ہوتی ہے وہ دل میں سوچتی کسی سے محبت کرنا اس کے لئے جان دینا بہت عظیم جذبہ ہے ہاں ماکو میں اس کا سارا جہان تھا۔ قزوین میں جہاں اس نے اپنے عم زاد کے ساتھ کچھ زندگی گذاری تھی۔ بچوں کو پروان چڑھایا تھا وہ جگہ اب اس کے لئے نہیں تھی۔

کرماشاہ میں علما چڑ گئے۔ ملا اس سے رواداری کا سلوک کرتے رہے تھے۔ انہوں نے اب اس کے باپ کو ایک برق رو قاصد کے ہاتھ پیغام بھجوایا کہ وہ عملی مباحث نہیں صرف دیوانگی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ یہ کوئی مذہب نہیں قرآن پاک کی آیتوں کی تاویلیں ہیں۔ ماکو میں "باب" کے پاس جانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں آپ اسے آکر لے جائیں۔ گھر کی زندگی کے لئے ضروری ہے کہ اسے بابی مذہب کی تبلیغ کرنے کی بجائے قزوین میں رکھا جائے۔ عورتوں کو آزادی دینے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ کسی اور کام کی نہ رہیں اور جہاں پر جی چاہے پھریں آزادیٔ افکار تو خوب ہے مگر یہ آزادی جس کا مظاہرہ ہو رہا ہے قابلِ قبول نہیں۔"

قاصد راستے کی چوکیوں پر گھوڑے بدلتا ہوا نہایت سرعت سے قزوین پہنچا۔

ملا صاحب خط پڑھ کر کھڑا رہا۔ پتہ نہیں وہ زمین کے کھلنے کا انتظار کر رہا تھا۔

خیمے بار کئے جا چکے تھے۔ پانی کی مشکیں خچروں پر رکھی گئیں اور وہ سوار ہونے والے تھے۔ جب طاہرہ کا بھائی پہنچا۔ دونوں آمنے سامنے دو دشمنوں کی طرح کھڑے رہے۔ وہ تین سال کے بعد ملے تھے اس عرصے میں وہ خوب لمبا اور مضبوط ہو گیا تھا۔ آنکھیں جھکائے خجل سا اتنے لوگوں کے درمیان اجنبیوں کی طرح وہ اسے کتنا اپنا لگا۔ اس کا جی چاہا۔ وہ اسے گلے لگا لے۔ پرانے دنوں کی طرح اسے پیشانی پر بوسہ دے مگر وہ کھڑی رہی اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اسے کسی سے محبت کرنے کا حق نہیں تھا ماسوا محبوب کے سب ہیچ تھا رشتے تعلقات اور پھر وہ تو پاک تھی طاہرہ اور وہ ناپاک تھا۔ ان کا ملاپ کسی طرح ممکن تھا۔ دشمن

بابی فدائین کا یہ قافلہ اس کی ایک نظر کے اشارے پر اس کی تکا بوٹی کرنے کو تیار۔ ان کی نظریں خونخوار تھیں۔ اس نے اپنا اٹھتا ہوا ہاتھ اپنے پہلو میں گرا لیا۔ آنسو پتہ نہیں کیوں امڈتے چلے آتے تھے اس میں یہ کمزوری ابھی باقی تھی مگر اس کی تربیت اس کی ریاضتیں وہ مجاہدے نفسِ امارہ کسی ایک جذبے کو بھی مارنے اور مطیع کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ اس کے گرد یہ سارے لوگ اپنے علائق کو توڑ کر اپنی جانوں کو نثار کرنے کو تیار تھے وہ سب اس سے بہتر مومن تھے وہ سوال کرنے اور شک کرنے کی منزلوں سے آگے گزر چکے تھے اور وہ جو ان کی استاد تھی ان کی راہبر تھی "باب" کا

حرف حتی تھی وہ تو اس قابل بھی نہیں تھی کہ ان کے ساتھ کھڑی ہو۔ سر جھکائے بنا کچھ کہے وہ بھائی کے ساتھ قزوین چلی آئی۔

اور یوں ہوا کہ پھر اسے تہران لے جایا جا رہا تھا اور وہ قزوین سے ہو کر گزرا یہ ستاروں کی گردش تھی کہ وہ مل نہ سکتے تھے۔ قیدیوں کی طرح سپاہیوں کے جھرمٹ میں معمولی گنہگار کی طرح وہ اپنی منزلِ موت کی طرف رواں تھا وہ لیظہر اللہ تھا۔ اس سے ملاقات ہونا لقائی رب سے فائز ہونا تھا اس پر ایمان لانا خدا پر ایمان لانا تھا۔ ماکو میں "باب" پر جتنی الواح نازل ہوئی تھیں وہ سب اس تک پہنچی تھیں وہ اس کے مذہب کا ستون تھی۔ ماں اسے دیکھتے ہی رو پڑی وہ اس کو گلے لگانا اور لپٹنا چاہتی تھی مگر پاک اور ناپاک کا فاصلہ درمیان تھا۔ مشیت کو یونہی منظور تھا۔ پتہ نہیں اس شیرازی چھوکرے نے اس پر کیا جادو کر دیا" ملا صالح نے کہا۔

"نہیں وہ شیرازی چھوکرا نہیں میرا رب ہے میرا محبوب ہے میرا خدا ہے" اس نے بہت تیزی سے کہا۔ ملا صالح نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنا چاہا تو وہ الگ ہٹ گئی ان کے اور اس کے درمیان زمانے تھے۔ حاجی ملا صالح اور ملا تقی بیٹھے رہے بیٹھے رہے وہ اکٹھے ہوئے تھے مگر دونوں اسی طرح سے اٹھ گئے انہیں اس صورت حال کے متعلق بات کرنے کے لئے لفظ نہ ملتے تھے وہ اپنے بچوں سے ملنا نہیں چاہتی تھی، ملا محمد سے ملاقات کرنے کی خواہشمند نہ تھی گویا وہ کسی کو پہچانتی ہی نہ تھی اور گذری ہوئی زندگی کا کوئی لمحہ ان تین سالوں سے پرے نہیں تھا۔ ماکو جانے والی جماعت کے بغیر اس نے قزوین آنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ حاجی ملا صالح کے قصر کے دروازوں کے سامنے اترے تھے اپنے آپ کو طاہرہ کا محافظ تصور کرتے تھے اور اپنے بابیوں کی موجودگی میں لوگ سخت پریشان تھے۔ وہ فدائین کی طرح آنکھیں جھپکائے مناجاتوں اور عبادتوں میں لگے رہنے والے لوگ جن کا "باب" سے پہلے کی زندگی سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا تھا ان کی زندگی اس لئے تھی کہ اپنی جانیں "باب" پر قربان کریں۔ وہ باہر ہیں اندر کی طرف دیکھتے ہوئے لوگ تھے۔ دنیا میں ان کے لئے ساری کشش محض شمع پر قربان ہونے والے پروانے بن کر جینا تھا۔

حاجی ملا تقی اس سے ملنے آیا تو وہ اپنے کمرے میں مناجاتیں کر رہی تھی پھر اپنے روزانہ طریق پر وہ مراقبے میں گم ہو گئی۔

"شیخ احمد احسائی اور سید کاظم رشتی پر خدا کی لعنت ہو کہ ان کا ذہن نے اسلام میں یہ رخنہ اندازی کی ہے انہوں نے غلط باتیں لکھ کر مذہب کی صورت بگاڑی ہے خدا ان کی قبروں میں آگ جلائے گا اور وہ دوزخ کا ایندھن ہوں گے"

"بچا میں تمہارا منہ لہو سے بھرا دیکھ رہی ہوں" اس نے مراقبے میں سے اٹھ کر کہا۔
ملاتقی تیز مزاج آدمی تھا مگر اپنے بھائی کی بیٹی کی بات سنی ان سنی کر کے وہ وہاں سے چلا آیا
ملا محمد نے ان تین سال میں اپنے شب و روز کو اس کے بنا گذارنے کا ڈھنگ سیکھ لیا تھا۔ بچے ماں کے بغیر اجاڑ گھر میں اپنی مرضی سے بڑھ رہے تھے۔ خادمائیں انتظار کرتے کرتے تھک کر انتظامات اپنے طور پر چلا رہی تھیں۔ اس کا آنا بچوں سے بہت پوشیدہ رکھا گیا تھا مگر پھر بھی خبر ان تک پہنچ ہی گئی تھی۔ بچے نانا کے گھر جانے اور ماں سے ملنے کے لئے بیتاب تھے۔

وہ ماکو میں "باب" پر نازل ہوئے الواح میں سے روح کا تعلق آیات متشابہات پر حاشیے لکھ کر اور ان کا فارسی ترجمہ کر رہی تھی۔ اپنے کمرے میں نہیں تہہ خانے میں کہ یہ ذرا سا کھلا ملا محمد کی بیٹی اس راستے پر کھڑی تھی جیسے روشنی اور اندھیرے کے امتزاج سے ابھرتی ہوئی کوئی خیالی تصویر ہو۔ "مادر" کسی نے پکارا۔ اس نے قلم ہاتھ سے رکھ دیا بے محابا اٹھ کر بازو پھیلائے اس کی طرف بڑھی اور دوسرے لمحے اسی تیزی سے واپس مڑی اور سجدے میں گر گئی۔ کانوں کو انگلیوں سے بند کئے تیزی سے مناجاتیں پڑھتی ہوئی "نہیں نہیں" میں اس پکار کا جواب دینے کے لئے نہیں ہوں۔ میں بہت آگے نکل آئی ہوں مختلف راہوں پر۔ اس پکار کا جواب اسے پیچھے کھینچ لائے گا گھٹتی ہوئی کانٹوں بھری راہوں پر دشت و صحرا وہ زخمی ہو جائے گی۔ "مادر" اس صورت نے پھر پکارا۔ طاہرہ نے اپنا سر زمین کے ساتھ پیوست کر دیا۔ وہ اس پکار کو قطعاً نہیں سنے گی کبھی نہیں۔ گھبرا کر ملا محمد کی بیٹی نے تیزی سے زینے طے کئے وہ تو اپنے ماموں کی بیوی کی مدد سے یہاں آئی تھی وہ کیسے کیا بتائے کہ وہاں اندر تہہ خانے میں کوئی نہیں تھا جو اس کی آواز سنے حاجی ملا صالح اندر آیا وہ خوف زدہ اور بیمار معلوم ہوتا تھا آنسوؤں سے اس کی داڑھی تر تھی آواز ڈوبی ہوئی تھی اور اس نے تہہ خانے کی سیڑھیاں لڑکھڑاتے ہوئے پار کیں۔

ام سلمیٰ دختر م اب وہ تمہیں لینے آئیں گے تمہارا چچا مسجد میں قتل کر دیا گیا ہے اور سارا قزوین سڑکوں پر ماتم کر رہا ہے وہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ میں تمہیں ان کے حوالے کر دوں۔ سیاہ بختی نے میرا گھر دیکھ لیا ہے۔ وہ نہایت اطمینان سے اٹھی۔ سیاہ چادر کو اتار کر سفید چادر سر پر اوڑھی اور مراقبے میں اپنا آپ لگا دیا۔
وہ قصر کے باہر جمع تھے ملا محمد سینہ کوبی کر رہا تھا اور ملا تقی کا جسد خاکی بھائی کے دروازے پر رکھا تھا۔ ان دونوں نے دین کی تعلیم اکٹھے حاصل کی تھی اور اب خاموشی بے طاقت وہ اپنی دادرسی

چاہنے کے لئے بنا کچھ کہے لیٹا تھا۔ لوگ نعرے لگا رہے تھے اور اتنا شور بپا تھا جیسے قیامت کا ہنگام ہو۔

قرۃ العین نے مناجاتیں پڑھیں اور تیاریوں میں لگ گئی۔ اس نے دروازے سے باہر جھانک کر دیکھا اس کے باپ کے باغ میں جیسے محرم کے روز تمثیل کی تیاریاں ہو رہی ہوں لگ ہی لوگ تھے گرمی غضب کی تھی بگولوں میں ہوا کے ساتھ پتے تھے اور سورج سوا نیزے اترا لگتا تھا۔ اس کے دونوں بھائی ہادی اور وہاب شرمندہ سے چچا کی میت کے ساتھ کھڑے تھے وہ ننگے سر تھے جیسے سید الشہداء کی سواری کے ساتھ ساتھ جانے کے لئے تیار ہوں

حاکم شہر کے پیادوں نے حاجی ملا صالح سے اجازت طلب کی قانون ملزموں کو پناہ دینے والوں کے لئے سخت ہے۔ پھر وہ اس کے سامنے سے اندر کے ایوان کی طرف آئے مگر ان سے پہلے وہ اپنے شاگردوں اور عورتوں کے جھرمٹ میں باہر آ گئی۔ قزوین کے حاکم کی طرف یہ سرگرداں جلوس بھیڑ میں سے راستہ بناتا پیدل چلا۔ ماتم کی صدائیں اب قصر میں سے آ رہی تھیں جیسے وہ عروس ہو اور اپنے گھر جا رہی ہو اور اس کے ہجر و فراق اور رخصت کے منظر کی تاب نہ لا کر اس کے رشتہ دار آہ و زاری کر رہے ہوں۔

"خادمہ کو داغ دینے کی تیاری کرو" حاکم نے کہا اس کے ہاتھوں کو اس سر کٹنے والے دروازے کے اس طرف داغا جائے گا اور پھر اس کی آقازادی کے ہاتھ کو بھی تا یہ اپنا قصور تسلیم کریں،" ام سلمیٰ نے اپنا بے نقاب چہرہ مالکن کی طرف کیا جہاں "باب" قید تھا اور زور زور سے مناجاتیں پڑھنے لگی۔ وہ اس کے عشق اس کی چاہت میں یہاں تک چلی آئی تھی مگر اسے کوئی گلہ نہ تھا اس کی محبت اور قائم کے وجود سے اس کی یگانگت پہ جو موت کی طرح زبردست ایک جذبہ تھا اسے کہاں سے کہاں لے آیا تھا اس ایک نکتے کے گرد وہ سب گھومتے تھے۔ پروانوں کی طرح جلنے کا شوق انہیں لئے پھرتا تھا وہ ایک دوسرے سے بڑھ کر قربان ہونا چاہتے تھے۔ یہ راہ جس پر کٹ مرنے کے لئے ایک بے مثال طاقت انہیں عطا ہوئی تھی۔ راہ محبت جس پر کوئی کسی کا رفیق نہیں ہوتا۔ ایک امانت انہیں دی جاتی ہے اور وہ الگ الگ اس کو سنبھالے رہتے ہیں، "قاتل گرفتار ہو گیا ہے،" باہر شور اٹھا۔

حاکم وقت کے دروازے کے سامنے ایک تمثیل پھر پیش کی جانی تھی۔

میرزا صالح نے اپنا سیاہ بالوں سے بھرا کسی یونانی دیوتا کی طرح کا خوبصورت سر بلند کیا ہوا تھا وہ اس بھیڑ میں سب سے اونچا اور پُر وقار تھا جیسے خواب دیکھتے دیکھتے چونک اٹھا ہو۔ وہ قاتل تو

نہیں لگتا تھا شاید ام سلمیٰ کو بچانے کے لئے یہ سارا کھیل ہو رہا تھا۔

"اگر تم لوگوں کو میرے کہے کا یقین نہیں تو جاؤ پل کے نیچے سے وہ خنجر نکال لاؤ جس سے میں نے وہ منہ بند کیا ہے جو شیخ احمد احسائی کے خلاف کفر کا فتویٰ لگاتا تھا۔"

قرۃ العین رہا کر دی گئی۔ باپ اسے گھر لے آیا۔

قزوین میں اب اس کا کیا تھا۔ کیا رہ گیا تھا۔ سارے علائق سے کٹ کر وہ یہاں کیوں رہے؟ اس کا ٹھکانہ کہیں اور ہونا چاہیئے۔ سیاہ آندھیاں سی چلیں۔ ذہن اور دل کا ایک حصہ ابھی دلدل کی طرح تھا اس میں اس کا وجود کہیں ابھی تک تڑپتا تھا۔ اسے بھی تو پاٹنا تھا۔ یہ قید بھی کیوں کیا اس کے لئے وہ کافی نہیں تھا آئینے پر گرد کیوں رہے۔ وہ حاجی ملا صالح کے ساتھ اپنا آخری رشتہ بھی کاٹ آئی۔ وہ گھر سے قزوین سے فرار ہو گئی۔

باب ہفتم

اس کے سامنے کھلی زمین اور کھلا آسمان تھا دشت نوردی اس وقت تک جاری رہنا چاہیئے جب تک اس صحرائے حیات کو پار نہ کر لے ۔ راہ میں کوئی شجرِ سایہ دار نہیں تھا وہ تو خود دھوپ تھی کہ حیات بخش عناصر اسی سے عبارت تھے ۔ "باب" جو خود آئینہ تھا شش جہات سے اس کے مقابل تھا ہر طرف وہی وہ تھا لقاء اللہ ۔ ماگو اس کے جہان کا نکتہ تھا ۔ بہا اللہ کہ وزیر زادہ تھا صاحب عز و جاہ تھا "باب" کا خاص الخاص معتقد تھا وہ چاہتی تھی ماگو جائے اس سے ملے اور اپنی جان کا بوجھ اٹھائے اٹھائے جو تھک چکی ہے اس آستان پر رکھ دے مگر بہا اللہ نے اسے روکا ۔ "یہ کیسے ممکن ہے کہ تم وہاں جاؤ اور چھپی رہو ۔ خطرات اور ناقابل برداشت مصائب کا مقابلہ ممکن نہیں ہوتا اس نے کہا میں خطرات سے نہیں ڈرتی ۔"

بہا اللہ نے کہا ۔ تمہاری جان سو اور طرح سے کام آ سکتی ہے تم اسے کیوں گنواؤ گی ۔"

اس نے سر جھکا لیا ہاں اگر وہ دنیا کے کسی کام آ سکے تو ۔

ملا محمد نے اپنی دستارِ فضیلت گلے میں ڈالی اور شاہ کے دربار میں دادرسی کے لئے حاضر ہوا ملا تقی کا خون کس کی گردن پر ہے؟ میرزا صالح تو قید خانے سے بھاگ گیا تھا ۔ بابیوں نے ہتھیلی پر سر رکھ کر اسے چھڑا لیا تھا ۔

وہ ایک بڑے مجتہد کے قتل کے لیے دادرسی چاہتا تھا شاہ نے کہا قاتل نہیں ہے اس کی غیر موجودگی میں تم ان بابیوں میں سے جو ابھی تک قید میں ہیں ایک کو قصاص کے طور پر قتل کر سکتے ہو گو یہ انصاف نہیں ہوگا ۔

پھر وہ قافلہ چلا اور ملا تقی کے مزار پر لوگ جمع ہوئے اور ان کو اس کے گرد پھرایا گیا اور پھر اذیتیں دے کر ہلاک کر دیا گیا ۔ ملا محمد نے دیکھا زندگی کے ایوان کی کڑیاں کرم خوردہ اور کمزور

اس کے گرد اس کے سر پر گر گئیں۔ سارا ایوان ہی منہدم ہو گیا۔ اس کا باپ نہیں رہا تھا۔ کسی کو بھی سزا دے کر اسے تسلی نہیں ہوتی تھی وہ دیوانہ ہو چلا تھا۔

"اے لوگو یہ استقامت کا وقت ہے عمل کا وقت ہے کلمۃ اللہ کو عام کرنے کا دن ہے شریعت کے پرانے احکامات منسوخ کرنے اور نئی شریعت کے اعلان کا دن ہے"

وہ "باب" کو ماکو سے چہریق لے گئے تھے اور اس پر سختیاں اور پابندیاں زیادہ کر دی گئی تھیں۔ قید خانے کے اندر وہ قرآن، بائبل اور توریت اور آسمانی صحیفے پڑھتا تھا "البیان" لکھنے میں لگا رہتا تھا وہ کہتا تھا اس پر یہ کلام نازل ہوتا ہے۔ اس نے محمد علی بار فروش کو دستارِ فضیلت اور باب الباب کو بھی دستار بخشی تھی۔ سبز رنگ کا کپڑا جوان کے اپنے رب کی طرف سے عطا کردہ تھا وہ سب ابھی جوان تھے جن کے دل جوش سے بھرے اور دماغ اس انقلاب آفریں مذہب کی تقدیس سے بھرے تھے۔ بار فروش کے دل میں شک و شبہات تھے مگر وہ ایسا جوان تھا جس نے جو راہ ایک بار اختیار کر لی اس پر زندگی اور موت کی پرواہ کئے بنا اسے چلنا تھا۔ قرۃ العین کا حسن اور جاذبیت اسے اس علم سے زیادہ پر کشش لگتی تھی جس کا اسے دعویٰ تھا۔ مذہب خالصتہً مردانہ شغل تھا اس کو پھیلانا اس کی ترویج و ترقی ان احکامات کی سوچ بچار عورت کے لئے نہیں بنائی گئی بہر حال وہ ایک عورت تھی جوان کی صفوں میں زبردستی در آئی تھی۔ اس کی معلومات مرعوب کن اور اس کی فصاحت حیران کن تھی۔ اس کا جوش اور عزم اور عجیب طرح کی جان نثاری آدمی کو پکڑ لیتی تھی۔ اور اس کے باوجود کہ وہ عمر میں اس کی بڑی بہن کے برابر ہو سکتی تھی وہ اس کے عشق میں مبتلا ہو گیا

اس کی آزاد روی مجلسوں میں بحث مباحثے گفتگو بے پردہ ماکو کی طرح چہرہ کر کے مناجاتیں مراقبے سب اسے ناپسند تھے وہ اسے ساری دنیا کی نگاہوں سے بچانا چاہتا تھا وہ تو اسے فلک کی آنکھ سے بھی چھپا کر رکھنا چاہتا تھا۔ مگر وہ اس صورت حال سے بے خبر تھی۔ علمی مشاورت اور مباحث کے درمیان کبھی کبھار وہ اسے اپنی طرف عجیب نظروں سے دیکھتا ہوا پاتی تو نگاہیں جھکا لیتی۔ سینے میں پکڑ دھکڑ اور تیز بے ترتیب سانسوں کو قابو میں کرتی۔ یہ نظریں جن کا مطلب کبھی وہ سمجھ پاتی تھی اور کبھی نہیں۔ وہ ایک عام عورت نہیں تھی جنابِ باب نے اسے طاہرہ کا خطاب دیا تھا۔ اس کی تو نگاہ بھی چیزوں کے حلال و حرام کو پاک کر دیتی تھی۔ پھر ان نگاہوں کا کیا مطلب یہ بڑی نرم مطلب سے پر۔ ہلچل مچا دینے والی دل کو دھڑکانے والی دیکھنے میں نہایت بے ضرر نگاہیں کیا تھیں؟ اسے وہ تمام خط یاد آ جاتے جو "باب" کی حمد و ثنا سے شروع ہو کر اکثر دعاؤں

پر ختم ہوتے تھے باقی لوگ بھی اس سے بے پناہ محبت کرتے تھے بے حد خلوص سے پیش آتے تھے۔ وہ ان کے لئے آسمانوں کا ایک بے داغ چاند تھی۔ شہزادیاں، مفتی، بڑے بڑے عالم اس سے بحث مباحثہ کر چکے تھے اس کی ذہانت کے قائل تھے وہ اس کی پرستش کرتے تھے۔ یہ تمام جاہ و جلال محمد علی بارفروش کے لئے بے معنی تھا وہ اسے اس کے حسن کی وجہ سے چاہنے لگا تھا۔ ہاں سچ مچ وہ گستاخ اور بے پرواہ لگتا تھا۔ اس سارے مجمع میں وہی تھا جو اپنے ہوش و حواس کے ساتھ سوچتا اور بات کرتا تھا وہ ہوا جو چلی تھی ہو سکتا ہے باد سموم ہو۔ وہ مذہب جس کو وہ عالمی برادری کے لئے کہتے تھے اور جس میں وہ اپنی مرضی سے بھی زیادتی کرتے رہتے تھے، غلط ہو سکتا تھا مگر جو محمد علی بارفروش کی آنکھیں کہتی تھیں کیا وہ سب جھوٹ تھا؟

اسے ملا محمد کے گھر سے نکلے زمانے ہو گئے تھے۔ چھپتے چھپاتے بھی عرصہ ہو گیا تھا یہ چوروں کی سی زندگی تھی۔ جس میں جوش و خروش اور انقلاب کی آہٹ تھی مگر وہ شکستہ ہی کے خلاف تھے۔ پھر وزیر زادہ ہونے کی وجہ سے اس کے وسائل بے شمار اور طاقت بے اندازہ تھی۔ وہ ان کا سرپرست مربی تھا۔ اب جب کہ قائم آل محمد کا مستقل ٹھکانہ بندی خانے ہو گئے تھے انہیں ایک قائم کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اس کے ٹھکانے بدلتے رہنے کی زندگی سے عاجز آ چلی تھی۔ یہ مذہب جس میں نہ کچھ ظاہر ہوتا تھا اور نہ ہی چھپتا تھا ایک ایسی چادر کی طرح تھا جس کو سر ڈھانپنے کے لئے اوڑھو تو پاؤں ننگے ہوتے ہیں اور پاؤں ڈھکو تو سر کھل جاتا ہے۔

بارفروش جناب قدوس تھا وہ اپنے نئے مذہب کی رو سے رسول خدا کا مظہر تھا۔ باب الباب ملا حسین بشرویٔ اس کے سامنے زانوئے ادب تہ کرتا تھا وہ سب جناب قدوس کی نہایت عزت کرتے اور اس کے حضور غلاموں کی طرح کھڑے رہتے۔ یہ ایک تمثیل تھی جس میں پرانے قصوں کو دہرانا اور شخصیتوں کو جگانا مقصود تھا۔ مگر لگتا ہے کہ یہ کپڑے ان کے قدوں پر بقول ان کے پورے اترے تھے۔ انہوں نے مستقل انہیں پہننے کا فیصلہ کر کے گویا اپنی اصلی شناختوں کو گنوا دیا تھا یا ان سے روگردانی کی تھی اور ان کے اصلی چہرے ماضی میں دھول دھول مٹے مٹے اور کچھ نہیں تھے۔ وہ سب "باب" کے مقلد بننے سے پہلے کچھ نہ تھے اگر وہ یونہی رہتے اپنے کاروبار زندگی میں لگے ہوئے تو کوئی ان کی طرف پلٹ کر دیکھتا بھی نہیں مگر یہ نئی رجعت کی وضع کردہ حکمت عملی ان کے ہر درد کا دوا تھی وہ بہت جوشیلے نوجوان تھے جن کو خواب نظر آتے تھے۔ صورتیں دکھائی دیتی تھیں جو اعداد کے ذریعے اپنے لئے بڑے بڑے نام وضع کرتے تھے۔ باب خود "نبیل" تھا۔ جس کے اعداد ابجد کے لحاظ

سے خود اس کے اپنے نام کے مطابق تھے۔ اس طرح صبح ازل "الواحد" تھا جس کو بہت چھوٹی عمر میں "باب" نے اپنے بعد البیان کو پورا کرنے کا حکم دیا تھا۔ پھر ان کے مذہب کے پوشیدہ دائرے تھے۔ جو دائرہ خیتا کی طرح ایک دوسرے کے باہر احاطہ کئے ہوئے تھے۔ ان کے اندرونی دائرے کے چار نقطے تھے وہ خود پھر ملا حسین بشروئی۔ پھر محمد علی بارفروش اور جناب طاہرہ۔ ان کے باہر اور اس کے باہر کائنات کی لامحدود وسعتوں تک پھیلے ہوئے۔

ہر مذہب جو دنیا میں پیغمبروں کے سوا پھیلا ہے یا اس کو پھیلایا گیا ہے اس کی شکل و صورت، اس کے اصول و قوانین بہت سوچ سمجھ کے بعد وضع کئے گئے ہیں اور اس کی عبادات کے لیے کئی پرت ہوتے ہیں جس طرح اسماعیلی فرقے والے اپنے صاحب الزمان کو ہی خدا کا درجہ دیتے ہیں۔ اس طرح وہ "باب" کے پیروکار بھی اپنی جان فدا کرنے اور اپنا سب کچھ اپنے "رب" پر نثار کرنے کو تیار رہتے۔ پھر جیسے جیسے آدمی ترقی کرتا اور اندرونی دائروں کی طرف بڑھتا تھا اس پر سے پابندیاں اٹھتی جاتی تھیں محمد علی بارفروش منتظر تھا کہ جناب طاہرہ کی وضع کردہ وحدت کی حکمت کے تحت جمال محبت + علم اکٹھے ہوں آخر کار اس پر غلبہ حاصل کرے۔ جیسے وہ سب اس کے غلام اور وہ ان کا بادشاہ تھا۔ وہ بھی ایک نکتہ تھا اور باقی اس کے گرد گھومتے تھے۔ سارے قوانین لوگوں کے لئے تھے ان کے لئے کوئی قید نہ تھی وہ دنیا کو سنوارنے کے لئے اٹھے تھے۔ حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے ان کے دلوں میں جو کچھ پوشیدہ تھا وہ ظاہر نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ وہ سب تقیہ کرتے تھے۔ جب ان سے مواخذہ کیا جاتا تو وہ سب باتوں سے انکار کر دیتے۔ ان میں دنیا داروں کی سی چالاکی تھی روباہ صفتی۔ جوش جنون میں اپنے اندر کے جلال سے چیزوں کو اپنے لئے سنوارنے کی طاقت ان میں نہ تھی۔ شعلے یہاں وہاں بھڑکانے میں انہیں دلچسپی تھی۔ کسی الاؤ کے جلانے میں انہیں اپنے جل جانے کا خطرہ تھا۔

پھر مغرب سے تند و تیز ہوائیں چلتی تھیں۔ انقلاب آفریں خیالات جو صرف خیالات ہی تھے کہ وہ حوصلہ ان میں نہیں تھا جس سے دنیا کو بدلا جا سکتا ہے۔ حکومت الہیہ قائم کرنے کے لئے جو بھی قربانیوں اور نیک نیتی کی ضرورت تھی وہ ان میں مفقود تھی وہ سیل تند رو نہیں تھے ان کے سیل ان کے اندر رہتے ابھی ان کی شخصیتیں نمو کی منزل سے آگے نہ نکلی تھیں۔ تناور اور سایہ دار درختوں کی طرح زمین پر پھیل کر اسے وہ دکھ سے امان دینے کے قابل نہ تھے۔ انہوں نے شروع میں بڑے بڑے خواب دیکھ لئے تھے اپنے آپ کو نائبین خدا اور خدا سمجھ لیا تھا ان کی تنظیم زیر زمین خفیہ تھی مگر بہت فاصلوں کی وجہ سے وہ منظم نہ ہو سکے تھے۔ حالات کے دھارے کو موڑنے کی ان میں قوت نہ تھی۔ پھر سب سے

بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ سب بالکل ناتجربہ کار تھے۔ تقریباً کم عمر اور ان کی سرپرستی کرنے والا مختلف بندی خانوں میں دن کاٹ رہا تھا کبھی وہ ماکو کے قید خانے میں ہوتا اور کبھی علما کی مجلسوں میں مباحثے کرتے ہوئے تقیہ سورج کرتا۔ سورج کی سی تیزی اور زندگی بخش حرارت سے ان کے دل خالی تھے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ طاقت حاصل کرنا ان کا مطمعٔ نظر تھا۔

"باب الباب"، بہت پریشان تھا وہ "باب" جس کو وہ رب الاعلیٰ کہتے تھے، سے ملنے کے لئے ماکو کے لئے چلا کیونکہ محمد شاہ قاچار مر گیا تھا اور محمد علی بارفروش کے تیور کچھ اور کہتے تھے ان سب کے ماضی نہایت اندھیرے تھے جن میں کوئی روشنی نہ تھی وہ تو کچھ بھی نہیں تھے۔ خود قرۃ العین یہاں آنے سے پہلے ایک دھند تھی جو اپنے ہی ذہن و دل پر چھائی رہتی تھی وہ نہ اپنا راستہ جانتی تھی اور نہ ہی کسی کو راہ دکھا سکتی تھی اور اب وہ "حرف حی" تھی۔ "باب"، نے پہلے صرف "باب" ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ پھر اس نے مہدی موعود ہونے کا آخر میں خود نکتہ ہونے کا اور یہ "حروف حی" تمام چیزوں سے پہلے وجود میں آئے تھے اور ان کا وجود نکتے سے تھا۔ وہ تمام چیزوں میں پھونکے گئے تھے اصل میں وہ خدا کی طرف سے اشارے تھے اس کے شاہد اس میں سے۔

کل تک قزوین میں وہ کچھ بھی تو نہیں تھی ملا محمد کی عروس کتب خانوں میں اپنا دل جلانے والی بیتاب ارواح اور آج وہ اپنے خدا کے وجود کا ایک حصہ تھی۔

"محمد علی بارفروش ہم سب کو جھکانا چاہتا ہے"

"اس دنیا پر میرا وقت اب ختم ہو رہا ہے میں تو صرف دعا کر سکتا ہوں"

رات بادلوں کی وجہ سے سیاہ تھی قید خانے میں ایک کمزور سا چراغ جل رہا تھا۔ "باب" کی آنکھیں کثرت مطالعہ سے دھنسی ہوئی تھیں اور عبادات کی مداومت کی وجہ سے وہ نہایت نحیف ہو گیا تھا۔ زرد روشنی میں وہ چہرہ جس پر کسی کی نگاہ نہ ٹک سکتی تھی بالکل زرد تھا جیسے چاند ہو"

"باب الباب" نے نہایت احترام سے نگاہ اٹھائی اس کی پلکیں جل رہی تھیں۔ پرانے دنوں کے ہم سبق دوست کے اور اس کے درمیان گویا جاودانی آسمان حائل تھے۔

حسین بشروئی تم مسکراتے تک نہیں ہو۔ شہاب ثاقب کی سی زندگی گذارنا ایک لمحے کی تیز چمک کے بعد فضاؤں میں گم ہو جانا ہمیشہ کے لئے ٹمٹماتے ٹھٹھرتے اور آسمان کی وسعتوں میں بھٹکتے رہنے سے بہتر ہے"

وہ چادر تان کر لیٹ گیا رہ رہ کر وہ چادر کے نیچے کپکپا اٹھتا جیسے وہ مرض الموت میں

گرفتار ہو یہ تشنج کی کیفیت تھی یا ذبح کئے جانے کی پھر جیسے بدن تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا ہو۔ چادر اتار کر اس نے ایک طرف رکھ دی۔ پسینے سے شرابور کچھ دیر بیٹھا خلاؤں میں چمکتا رہا اور پھر اس نے ایک کاغذ پر لکھنا شروع کر دیا۔

یہ قدوس و طاہرہ کے لئے ہے انہیں مبارک ہو۔ ان پر سلام ہو ان پر سلامتی ہو۔ مگر ملا حسین بشرویی کو یہ پیغام قرۃ العین پر پہنچانا نصیب ہی نہیں ہوا۔ وہ مخدوش حالات دیکھ کر ماکو سے طبرسی کی طرف چلا گیا اور شاہ رود جہاں پر وہ سب جمع ہونے والے تھے کبھی نہ پہنچ سکا۔ شاہ رود عام راہوں سے ہٹ کر البرز کی پُر فضا وادی میں باغوں اور چشموں سے گھرا خاموش سا گاؤں ہے جس کی آبادی بہت کم ہے۔ تند و تیز ہوائیں یہاں آ کر سرگوشیاں کرنے لگتی ہیں۔ خوشبو کے جو بار پھلدار درختوں تلے بہتے ہیں اور پھولوں پر کی شبنم پینے کے لئے رات بہت دیر تک سایوں میں ٹھہری رہتی ہے گنگناتے پانیوں سے بھرے حوض معطر ہوتے ہیں اور پائیز کی ہوا نوروز سے زمستان تک بہت خوشگوار ہوتی ہے۔

محمد علی بار فروش جو جناب قدوس تھا معزز ور اپنے ہونے اور آگہی سے معمور اپنے نہاں خانۂ دل میں حروف حیّ کے اس شاخسانے پر ہنستا بھی تھا اور اس کے نئے پن سے رگوں میں ترنم محسوس کرتا تھا رب الاعلیٰ نے اس کو نہایت عمدہ نام دے کر اعلیٰ ترین درجہ پر فائز کیا تھا اس میں رسول پاک کی روح بقول ان کے حلول کر گئی تھی اس لئے وہ واجب الاحترام تھا اس کی چال میں وقار اور ناز تھا۔ اب جبکہ "باب الباب" یہاں نہیں تھا اور بہا اللہ نے نہ ابھی "باب" کو دیکھا تھا نہ اس سے ملاقات کی تھی۔ وہ بلا شرکت غیرے مدشت کی اس مجلس مشاورت کا رب الاعلیٰ تھا۔ کیونکہ قرۃ العین طاہرہ اپنی ساری علمیتوں، عبادتوں اپنے حسن اور نازکی سمیت صرف عورت تھی۔ مذہب کا بار امانت کوئی عورت اٹھا نہ سکتی تھی۔ اپنی بہادری، شیر دلی، قوت برداشت اور ملا صالح کی صاحبزادی ہونے کے باوجود وہ حرف حیّ ہونے کے باوصف، نرم و نازک حدتوں میں پگھل جانے والی معشوق صفت خاتون تھی۔ جسے اپنے حسن سے گناہ کی حد تک آگاہی تھی۔ جو اپنی آواز کے سحر کو جانتی اور اپنی نگاہ کی شوخی اور اپنے خیالوں کی ندرت کو منزل بہ منزل سنبھل سنبھل کر استعمال کرنے کے فن میں تاک تھی

تینوں باغ خیموں سے بھرتے جا رہے تھے۔ سیاہ پردوں سے سیاہ مزین جھنڈوں کے اڑتے ہوئے نشانوں کی وجہ سے دوسرے خیموں سے ممتاز قرۃ العین کا خیمہ درمیانی باغ میں تھا۔ بہا اللہ وزیر زادہ تھا اور یہ باغ اس کا اپنا تھا جس میں وہ فروکش تھا۔ پھر دوسرے سرے پر

محمد علی بارفروش کی بارگاہ تھی جس پر سیاہ اور سفید دو جھنڈے تھے وہاں نسبتاً خاموشی تھی کہ وہ سنجیدہ اور متین اور کم گو آدمی تھا۔ سارے بابی اس کا بے مثال احترام کرتے تھے۔ جتنا "باب" کا۔ وہ سب جو یہاں جمع تھے سرزمین ایران، مازندان، خراسان اور مشہد سے آئے تھے خفیہ تنظیموں کے سربراہ اور قتل و غارت کرنے والے اپنے رب کے نام پر فدا ہونے والے لوگ تھے۔ ان کے چہرے تنے ہوئے اور بے رحم تھے۔ جیسے وہ منگلوں کی قرولتائی میں شریک ہونے آئے ہوں۔ جو چنگیز خاں نے قراقرم اس سیاہ فصیلوں والے شہر میں منعقد کی تھی۔ یہ مجلسِ مشاورت تھی بڑے پیمانے پر وہ باب کی قید سے تنگ آئے ہوئے تھے اور کوئی آخری مضبوط قدم اٹھانا چاہتے تھے ان میں بے مثال جرأت اور اندھا جنون تھا وہ سب غالی تھے انتہا تک پہنچنے والے۔ محبت اور نرمی کی فضائیں یہ خون آلودہ ہوا تھی جوان سب پر چل رہی تھی۔ وہ موت کو بے پناہ چاہنے والے تھے۔ انہیں کسی دوسری زندگی پر آنے والی قیامت پر مرنے کے بعد جی اٹھنے پر یقین نہ تھا یہ مذہب آج اور اب اس گھڑی کا تھا وہ سب حکومت کے خواب دیکھنے والے دیوانے تھے۔ جن کے اپنے وجود رہن رکھے ہوئے تھے اور جن کو آئندہ کی باتیں کسی دوسری کائنات کی باتیں معلوم ہوتی تھیں اس لئے وہ بے درد، بے رحم جنگجو کی طرح جس کی تلوار کی کاٹ گہری ہو اور جو پیچھے ہٹنا رحم کرنا نہ جانتا ہو تلے ہوئے تھے۔ ان کی تمنائیں محدود اور آرزوئیں محدود تر تھیں۔

مجلس مشاورت کے لئے جو خیمہ ایستادہ کیا گیا تھا اس کی چھت اونچی اور شاندار تھی۔ حاجب دائیں بائیں کلاہ پہنے مؤدب کھڑے تھے اور منقش پردے پر "باب رب الاعلیٰ" لکھا تھا۔ جو سنہری حروف ہونے کی وجہ زیادہ نمایاں تھا۔ اندر سب بیان کی آیات لکھی تھیں۔

" یقین سب سے بڑی جنت ہے۔
" بیان میں یقین رکھنے والوں سے جنت بنی ہے "
" بیان ہی جنت ہے۔"
جنت وہاں ہے جہاں مومنین ہیں۔
فرقان کی جنت بیان ہے اور ہر شے کی جنت اس کا کمال ہے۔
" ہر زمانے کی جنت اس زمانے کی تکمیل ہے۔"
جہنم یقین کی نفی ہے اور بے یقینی سے بڑا کوئی جہنم نہیں۔
جہنم نا مختتم ہے مگر جہالت کا درجہ سب سے آخری ہے۔

جہنم انکار کا دائمی ہونا ہے۔

" جو بیان کا انکار کرتا ہے وہ جہنم میں ہے "

" جہاں کوئی مومن نہیں وہ جگہ جہنم ہے۔ "

سب طرف آئینہ کا عدد مختلف صورتوں میں لکھا تھا۔ جو واحد کا عدد ہے۔

پھر حرف حی بار بار جیسے آئینے میں ایک ہی صورت کے دکھائی دینے کی طرح ہر طرف لکھے تھے۔ جیسے طوطی کو شش جہت سے آئینہ مقابل ہو حروف حی جو واحد کے عدد تھے۔ جس طرح ہر پیغمبر اپنے حواری کو خود چنتا تھا اسی طرح "باب" نے بھی اپنے ان ساتھیوں کو چنا تھا وہ نکتہ تھا اور یہ اس سے پیدا ہوئے تھے۔ یہ پھونکے گئے تھے جب دنیا بنی تھی اور وہ خدا تھا اور یہ سب اس کے بازو اس کے ساتھی اس میں سے تھے

پھر عین سامنے داخل ہوتے ہی ایک طلسم پر نظر پڑتی تھی۔ ایک بہت بڑا دائرہ تھا۔ " خدا پیج ہے اس کے سوا سب مخلوق ہے اور سب اس کی پرستش کرتے ہیں۔ "

طلسم کچھ یوں تھا ایک اندرونی دائرہ جس میں ایک مربع تھا۔ سات مساوی حصوں میں تقسیم اور ان حصوں میں واحد لکھا تھا۔ اس دائرے کے باہر سات اور دائرے تھے۔ ہر دائرہ ۱۹ حصوں میں بنا ہوا ہر حصے میں واحد کے اعداد یا کوئی اور لفظ جو اس کے برابر ہو لکھا تھا۔ سب سے آخری اور بڑے دائرے میں آیت الکرسی سنہرے حرفوں میں لکھی تھی۔ جو اس کے مختلف حصوں میں تقسیم کی گئی تھی اور اسے احاطہ کئے ہوئے تھی۔ سب سے اندرونی دائرے کے اندر بھی عبارتیں سنہری تھیں اور اس کے باہر سیاہ۔ عبادات کے لئے واحد کی مختلف اشکال لکھی تھیں۔ واحد۔ وحید۔ وحاد۔ احد۔ مواحد۔ مواحِد

متواحد وغیرہ وغیرہ۔

اس کے برابر برابر قیامت کے مختلف نام تھے۔ جاہل لوگ نہیں دیکھتے مگر قیامت گزر چکی۔ کیونکہ محمد اور علی کے نام اکٹھے ہو چکے ہیں۔ محمدؐ اور علیؑ کے نام مسند کے اوپر لکھے ہوئے بہت واضح تھے۔ لوگ اپنی جگہوں پر بیٹھے تھے ان کے دلوں پر ہیبت طاری تھی۔

آخر میں قرۃ العین اپنا سفید لباس پہنے نقاب اوڑھے ہوئے آئی۔ حاضرین سرو قد کھڑے ہو گئے ان کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور دل سینوں میں دھڑک رہے تھے۔ وہ یہاں اکٹھے ہوئے تھے کہ نئی سلطنت کی بنیاد رکھ سکیں۔ وہ دلوں میں امیدیں لئے پہنچے تھے کہ سرزمین ایران۔ ماژندران۔ فارس۔ خراسان۔ میں اس سورج کی روشنی سے اور روشنیاں پیدا کر سکیں۔ وہ پہلی شریعتوں کو رد کرنے اور نئے اعلان سے ایک نئی شریعت کا آغاز کرنے آئے تھے حروفِ حیؑ کے بعد وہ بھی تھے۔ کاروبار حیات میں جاری و ساری

طلسم کے زیر سایہ وہ اپنی جانیں اس کے حوالے کرنے آئے تھے یہ جان کا خدا تھا۔ یہ عصر باقی زمانوں سے مختلف تھا۔ ایک نیا عالم وجود میں آرہا تھا اور وہ اس کے بنانے والے تھے۔ خیمے کے باہر آگ روشن تھی جس میں وہ اپنے سارے پرانے اعتقادات شکوک و شبہات جلا کر اندر داخل ہو رہے تھے۔ اگر کسی کے دل میں کوئی شک کوئی انکار باقی تھا تو یہ آگ اس کو پاک کر دے گی۔

بیان کی تلاوت کے بعد :۔

محمد علی بار فروش اٹھا۔

"اے میرے رب جب تجھے نیند آجائے تو میں تیری وراثت کی حفاظت کے لئے تیرے خیمے کے باہر ایستادہ رہوں گا جیسے پرانا سایہ دار درخت جس کو کوئی طوفان کوئی زلزلہ کوئی قیامت جڑ سے اکھاڑ نہیں سکتی۔ جو گھنا اور خاموش ہوتا ہے مضبوط سمندر کی طرح گہرا اور محبت میں دھیما۔ بارشوں اور جھینگوں میں بھی اسی طرح کھڑا"

اطراف سے آئے ہوئے "بلیغ" کے مقلدوں نے ان کے حضور اپنی اپنی کارگذاریاں بیان کیں خفیہ مجلسیں۔ اپنے دشمنوں کو راستے سے ہٹانے کے لئے لائحہ عمل۔ مذہب کی ترویج و ترقی کے لئے سفارشات۔ یہ دن انتھک محنت اور ریاضت کے تھے۔ سب رخصت ہو جاتے تو وہ دونوں خیموں میں بیٹھے اعداد و شمار سے طلسم کی مدد سے اشارات اور مدد طلب کرتے۔ محمد علی بار فروش کا پراسرار بیان اور پراسرار مسکراہٹ کبھی اسے گھبرا دیتی مگر وہ اسے اپنے دل کا وسوسہ سمجھ کر بھول جاتی۔ اس مذہب کی سچائی کی سب سے روشن دلیل اس کے لئے جانیں قربان کرنے کا جذبہ تھا۔ یہ سرشاری کیفیت دوسرے مذاہب میں بہت بعد میں آتی ہے۔

"بیان" کو اعراب سے آزاد کر دیا گیا تھا۔

بائیبل۔ توریت اور باقی آسمانی صحیفے بھی سچے تھے اور ان میں ردّ و بدل کی تہمت ملاؤں اور مجتہدوں کی طرف سے لگائی گئی تھی۔ سب ٹھیک تھا اور خدا جنت میں خوش تھا۔ بدشت کے بہشت پر چاند نکلا۔ درختوں کے سایوں میں شب ماہ اپنی زلف عنبریں کھولے کسی بدمست معشوق کی طرح محو خرام تھی۔ مئے زندگی کا جام ہاتھ میں لئے سوچتی ہوئی کہ اس نے جتنے تماشے آج تک یہاں دیکھے تھے ان میں سے کونسا زیادہ دل خوش کن تھا لاجواب اور مکمل! اگر انسان خدا بن جائے تو کتنا مضحکہ خیز لگتا ہے۔ خدا نے آدم کو پیدا کیا اس کی پیشانی میں اپنا نور رکھا اس کے اندر اپنی رُوح پھونکی۔ بیج کے اندر تناور درخت بننے کی پوری صلاحیت ہوتی ہے۔ اس کے باوجود بیج درخت تو نہیں ہوتا۔ بیج ہی ہوتا ہے۔ انسان

اپنی ساری ممکنات کے باوجود انسان ہے۔ وہ کائنات نہیں بن سکتا۔ کبھی کبھار کوئی یہ بات کہنے کی جرأت کرتا ہے کہ وہ خدا ہے اور یہ بہت بڑی بات کہتے ہوئے اس کا اپنا جی تو ڈر جاتا ہے۔ بیج اگر اپنے اندر درخت کو اگتے پھلتے پروان چڑھتے محسوس کرلے تو وہ پھٹ جائے اس کا اپنا وجود فنا ہو جائے۔

پتہ نہیں یہ کونسی طاقت تھی کہ سارے پیغمبروں کی روحیں بدشت کے باغوں میں اترے لوگوں کے دلوں میں حلول کر گئی تھیں اور پھر بھی وہ ہولے ہولے بحث کرتے تھے۔ بڑے بڑے لفظ اپنے لئے تجویز کر کے نہایت عظیم الشان بن گئے تھے۔ سارے مذہبوں کے فلسفوں کو جوڑ کر انہوں نے اس نئے مذہب کا فلسفہ تجویز کیا تھا۔ ان کے "نکتہ" کاف۔ آئینے کا سب سے بڑا اعجاز وہ کتاب تھی۔ جو ماکو اور چہریق میں قید کے دوران اس پر نازل ہو رہی تھی۔ قائم ان ساری پابندیوں سے بلند تھا جو عام لوگوں پر عائد کی جاتی ہیں۔ وہ اپنی مرضی سے لوگوں کو بیویاں بدلنے اور ازدواجی زندگی کی استقامت اور معاہدے کو توڑنے اور پھر سے جوڑنے پر آمادہ کر سکتا تھا۔ اس کا حکم حاکم آخر تھا اور مذہب کی سچائی کی سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ لوگ اس پر جانیں قربان کرنے کو عین ثواب سمجھنے لگے تھے۔ وہ حشیش پینے والوں کی طرح اپنی جنت کی حفاظت کرنے اور اس پر فدا ہونے کو سب کچھ سمجھتے تھے۔ لفظ جو ایک دوسرے کے مقابل تھے آپ دوسرے کے سزاوار تھے۔ اہرمن۔ یزدان کے لئے۔ جنت اور جہنم۔ نور اور نار۔ علم کے کل ستائیس حروف تھے۔ کل انبیاء پر صرف دو حرف ظاہر ہوئے باقی کے پچیس حروف طاہرہ کے محبوب باب پر ظاہر ہوئے۔ ایک راہب نے موسیٰ کاظم سے پوچھا تھا کہ ان آٹھ حروف کے متعلق خبر دیجئے جو چار تو زمین میں باقی رہ گئے اور باقی چار ہوا میں ہیں وہ کس پر نازل ہوں گے ان کی تفسیر کون کرے گا۔ حضرت موسیٰ کاظم نے کہا وہ قائم آل محمد پر ظاہر ہوں گے۔ اور وہ راز جو صدیقوں رسولوں اور نبیوں پر بھی ظاہر نہیں کئے گئے۔ اس لئے خدا کا جلوہ قائم آل محمد کا جلوہ ہے کیونکہ وہ خدا کے ظہور کا مقام ہے۔ پرت اندر پرت اسرار کے اسرار اٹھ رہے ہیں۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم پھر سے محمد علی بار فروش میں جلوہ گر ہوئے ہیں۔ حضرت بی بی فاطمہ رضی قرۃ العین طاہرہ میں حلول کر گئی ہیں اور اسی طرح امام بھی پیدا ہوئے ہیں۔ شیعہ اور سنی دونوں عقائد کو ملا کر ان کی نفی سے یہ مذہب ظاہر ہوا ہے جس کا خدا ماکو میں قید تھا۔ وہ "شیرازی چھوکرا" جس کی محبت سے حاجی ملا صالح نے اپنی صاحبزادی کو منع کیا تھا۔ مختلف بندی خانوں میں تھا اور اس کے پیرو بدشت میں جمع ہو کر اس کی رہائی اور اپنے دین کے لئے غور کر رہے تھے۔ الواح اتاری جا رہی تھیں اور اس ڈرامہ کا اختتام قریب تھا۔

بابِ ہشتم

ڈھلتی شام میں فاصلے پر پہاڑوں کا سلسلہ نیلی دھند میں چھپا تھا۔ بادل اونچے درختوں پر تیر رہے تھے۔ پرندے زن زن گزرتے اپنے ٹھکانوں کی طرف جا رہے تھے اور شاخوں میں چہکاروں اور بولیوں سے بہت رونق تھی۔ پھولوں کی نرم و نازک پتیاں دن کی تمازت اندر اتارنے کے لئے اپنے دروازے تتلیوں اور آوارہ کیڑوں پر بند کر رہی تھیں۔ درخت نیم خوابیدگی کے عالم میں تھے جب ام العالم کے باغ کے دروازے پر ایک مومن آیا اور باریابی کی اجازت چاہی۔

وہ بہت دور سے آیا تھا۔ گردِ سفر اس کے عمامے، کپڑوں اور پلکوں پر جمی تھی۔ خچر تھکن سے ادھ موا ہو رہا تھا۔ خود پیغام لانے والا خوف کی وجہ سے سہما ہوا تھا۔ اس نے پردے کو پکڑ کر جان کی امان چاہی یہ ایسی خبر ہے جس سے آپ خوش نہیں ہوں گی"

" قرۃ العین نے کہا ڈرو نہیں اور اپنا مدعا بیان کرو"

"کبھی ایسا نہیں ہوا ام العالم مگر ہو گیا ہے" وہ زمین پر سجدے میں گر گیا۔

"اٹھو اور کہو" اس کی آواز محبت اور نفرت کے بنا تمکنت اور شان سے مملو تھی۔ جیسے وہ سچ مچ ملکۂ عالم ہو اور شاہ رود کے اس باغ میں اپنے تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہو" قزوین میں منادی کے ذریعے خاص و عام کو مطلع کیا گیا ہے کہ ملا محمد اور آپ اب کے بعد زندگی کے ساتھی نہیں رہے" وہ بات کہہ کر نظریں جھکائے خاموش ہو گیا۔

"اس کو سکون پہنچاؤ"

ام سلمیٰ نے پردہ چھوڑ دیا۔ وہ رنج کے بنا کچھ محسوس کئے بنا آ کر پھر مسند پر بیٹھ گئی۔ شام رات میں ملی۔ ہوا نے طوفان کی صورت اختیار کر لی۔ پھولوں کے سر ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے رہے خیموں کی دیواریں ہلیں

آندھی یخ بستہ برف کے اوپر سے آتی ہوئی اپنے دامنوں کو پھیلاتی رہی کسی بہت بڑے پرندے کی طرح

" میں ام سلمیٰ سے ام العالم بن گئی ہوں کہاں سے کہاں۔ میں کہاں سے کہاں گذر گئی ہوں، جیسے ہوا کے جھونکے نہایت آہستگی سے بڑھتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ تناور درختوں کے سر جھکاتے ہیں جیسے انسان اپنی عبادات میں غلو کرتا ہے۔ یہاں تک کہ یزدان بکمند آور۔

" ہمدان میں ملاؤں نے اس پر بحث کی تھی۔ آدمی بے حیثیت اپنے اشواق کے پر لگا کر اڑے بھی تو کہاں تک اڑ سکتا ہے۔؟"

وہ اپنے باپ سے بھی الجھ پڑا کرتی تھی۔ اس کے ذوق و شوق نے راہ کی تھوڑی رکاوٹیں ذرا ذراسی دیواریں چھوٹے چھوٹے گڑھے پاٹ لینا سیکھے تھے۔ اسے ملاؤں کی اس بیجا بحث پر بہت غصہ آیا تھا مگر اس نے نہایت متانت سے کہا تھا "سراپردۂ اسرار سے بھی پرے"

سراپردۂ اسرار سے بھی پرے" سب نے ایک ساتھ کہا تھا۔ معراج کی شب جہاں تک جبرائیل نہ پہنچ سکے۔ جہاں فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں؟

" انسان کے اپنے اختیار میں ہے کہ وہ ان نہاں خانوں کا مالک بنے جہاں فرشتوں کی رسائی نہیں" اس کے جواب سے غلغلۂ الحفیظ والامان بلند ہوا۔

انسان خود تجلیات خداوندی کا مالک بن سکتا ہے وہ اپنی رسائی کے سامنے خود بھی عاجز ہے" ممکنات۔"

ملا چیخ اٹھے مباحث ختم کئے گئے وہ یہ کلمات کفر سن نہیں سکتے تھے۔ اسے شہر بدر کر دیا گیا یہ باتیں آدمیت کے لئے بمنزلہ کفر کے تھیں۔ ملاؤں کے چہروں پر تکدر، ہراس دخوف تھا وہ اپنے کانوں پر ہلکے ہلکے طمانچے مار رہے تھے۔ وہ رب الارباب کی جگہ کسی کو دیکھنے کو تیار تو کیا ہوتے۔ انہیں ایسا لگا جیسے آسمان ان کے سروں پر موجود نہ ہو اور کائنات میں زلزلہ آرہا ہو۔

اس سے درخواست کی گئی اور زبردستی منوایا گیا کہ اب وہ کچھ نہ کہے گی۔ مگر انسانیت کی یہ توہین ارض شوق کی یہ تنگی۔ تخیل کے پروں کی شکستگی اسے پسند نہ تھی۔ گھبراہٹ سے لگتا تھا دم گھٹ جائیگا ایک گھڑی کے لیے اس نے سوچا تھا کہ وہ واپس جاکر اپنے گھر اور بچوں کے درمیان بس جائے گی جو کچھ اس نے سید کاظم رشتی سے سیکھا تھا۔ خوابوں میں دیکھا تھا۔ تجربہ کیا تھا وہ بھولنا اگرچہ ممکن نہ تھا مگر وہ بھول جائے گی۔ فضا میں اڑتے پرندوں پر خدا کی پیدا کردہ باقی مخلوقات پر تو کوئی پابندی عائد نہیں اس پر کیوں؟

مگر وہ شور و شغب، طعن و تشنیع، شک و شبہ، اس کے لئے تازیانہ شوق ثابت ہوئے اس کا باپ اپنی ساری علمیت کے باوجود سمجھ نہیں پاتا تھا پھر وہ کسی اور سے کیا گلہ کرتی۔ ملا محمد اتنے زمانوں کی دوری کے باوجود اسے ہنسی آئی۔ خیمے میں کوئی چراغ نہیں تھا۔ کوئی اس کے پاس صرف اس کے طلب کرنے پر آسکتا تھا اگر وہ چاہے تو ہنستے ہنستے بےحال ہو سکتی تھی۔ ملا محمد نے اسے آزاد کر دیا تھا کیا اس سے پہلے وہ قید تھی؟ ساری پابندیوں کو پھلانگ کر سارے رشتے توڑ کر وہ وہاں تھی جو ملا محمد کے پرواز تخیل کو بھی معلوم نہ ہو سکتا۔ "ام العالم" بھلا کسی کمزور انسان کا کوئی رشتہ اس سے استوار ہو سکتا تھا؟

نہیں اس نے اپنے سر کو زور سے جھٹکا کیونکہ دائیں بائیں سے اسے کوئی پکار رہا تھا ام العالم نہیں صرف "زرین تاج" کہہ کر "زرین تاج" وہ اٹھ کر تیزی سے گھومی مگر یہ پکار کہیں پرے سے آرہی تھی۔ درد سے بےچین کرتی ہوئی۔ ایسی سرگوشی جس کو صرف وہی سن سکتی تھی وہ کھڑی ہو گئی اور گوش برآواز اپنے سارے وجود کی پوری قوت کے ساتھ سنتی رہی۔ یہ کہاں سے کوئی اسے بلاتا تھا۔ یہ کون اسے پکارتا تھا کہ اس کا رواں رواں وفور شوق سے بےتاب ہو رہا تھا۔ یوں میٹھی کہ جیسے شہد گھلا ہو۔ کن نہاں خانوں کے اندر سے کوئی کشاں کشاں اسے اپنی طرف کھینچتا تھا۔ اس کا یہ نام تو سوائے چند کے کسی کو معلوم نہ تھا۔ "باب" نے جہاں اسے طاہرہ کہہ کر مخاطب کیا تھا وہ کبھی کبھار اسے "زرین تاج" بھی لکھتا تھا پتہ نہیں کیوں؟

اور اس کی روح نہایت مضطرب ہوئی نہایت بےقرار جیسے آندھی میں اپنے آشیانے کے تنکوں پر روئی کے بستر میں نرم و گرم آسودہ چڑیا کو کوئی ڈراؤنا خواب چونکا دے۔ وہ جھولا جھولتے ہوئے کانپ کر اٹھ جائے اور کھلی فضا کے دروازوں کو اپنے پر بند پائے۔ دے جھولا دے ہستی اور نیستی کی لہروں پر دے جھولا دے۔ اوپر اور اوپر دے جھولا دے۔

میں تمہاری پکار سنتی ہوں میں آتی ہوں۔

زرین تاج۔ زرین تاج۔ وہ جو ماکو میں تھا شاید اسے میری ضرورت ہے۔ باہر باغ میں ادھر ادھر پھیلے خیموں میں خاموشی تھی آندھی کب کی تھم چکی تھی۔ پچھلی راتوں کا چاند ابھی درختوں کی پھونگوں کی زردی میں تیر رہا تھا اور حوض میں شاخوں کے سایوں کے اندھیرے میں ستاروں کے جھولے میں جھولنے کی تیاری میں تھا۔ دے جھولا دے۔

ساری کائنات زرین تاج زرین تاج پکار رہی تھی۔ سرگوشیوں میں ہوا کے ساتھ پتوں پر

رنگتے جھونکے مسلسل جاری وساری یہ صدا آسمانوں سے زمین سے اسے پکارتی تھی۔

کافیہ نے اس کے ساتھ جانا چاہا مگر اس نے اشارہ کر دیا اور تاریک روشوں پر نکل گئی۔ اس کے اندر بہت ہلچل مچی ہوئی تھی۔ "ملا محمد کو مجھ سے عشق تھا"

عشق کا تقاضا تھا کہ وہ اس کی ساری غلطیوں سے درگزر کرتا۔ تعلیم، نفاست تربیت کی وجہ سے وہ اس سے بہت بلند تھی۔ وہ ہمیشہ بہت متاثر رہا تھا۔ عام عورتوں سے بالکل الگ۔ وہ نیلے آسمانوں کی طرف سے ایک نادر تحفہ سمجھی جاتی تھی۔ اس کے علم زادنے کبھی اس کی زندگی میں کسی قسم کا تعرض نہیں کیا تھا۔ وہ ایک طرح سے تو اس سے دبتا تھا۔ بیوی کی عمدہ فراست اور مکمل سعادگی سے کتابوں میں منہمک رہنے کی وجہ سے مرعوب رہتا۔ کتنے طوفان اس پر سے گزرتے تھے مگر ہمیشہ اس یقین کے ساتھ کہ ملا محمد کسی قیمت پر بھی دستبردار نہیں ہوگا۔ اس نے قطع تعلق نہیں کرے گا۔ ازدواجی زندگی جس کو ٹھکرا کر وہ چلی آئی تھی اتنے دنوں ذہن کے بہت پیچھے لاشعور میں جا بسی تھی وہ اپنے جسم کو تقریباً بھول چکی تھی۔ بہت کچھ اتنی تیزی سے کرنا پڑتا تھا کہ جسم ایک بیکار سی شے بوجھ بن کر رہ گیا تھا۔ جسے کسی نہ کسی طرح گھسیٹنا تھا۔ بھلا ایسے میں جب ہی سلطنت کی بنیادوں اور اپنے محبوب کی رہائی کی کوششوں میں پوری قوت لگائی اور مدافعت کے زیر زمین رہنے کے دوسری جگہوں سے اپنا واسطہ قائم رکھنے میں عقل و فہم و ادراک کی ضرورت تھی جسم اسے کہاں یاد رہتا۔ مگر آج اسے ایسا کیوں لگ رہا تھا کہ اگر کسی نے اسے سہارا نہ دیا تو وہ منہدم ہو جائے گی۔ کسی اجاڑ کھنڈر کی بوسیدہ چھت کی طرح زمین پر آ رہے گی۔ عورت کی جبلت آسرول کے لئے اس کی خواہش اپنے گرد نہایت مضبوط بازوؤں کی ضرورت۔ ایک ایسی صورت کو دیکھنے کے لئے کھلی آنکھیں جو اس سے بلند عظیم اور نہایت طاقتور ہو۔

میری رگوں میں آدھا خون توان اجداد کا ہے۔ جنہوں نے صحراؤں سے اٹھ کر مشرق و مغرب کی عظیم سلطنتوں کی بنیاد ڈالی تھی اور باقی خون منگول تھا۔ تاتاری جنہوں نے مملکتیں اجاڑی تھیں شہروں کو دشت بنایا تھا۔ خون کی امانتوں سے مفر کہاں بچے بچائے کپڑے جو عورت کے غرور اس کے ناز کی وجہ تھے جو نہ جانے کیسے ایک سے دوسری، تیسری اور سترھویں نسل میں منتقل ہو جاتے تھے۔ وجود جو افزائش نسل کا مقدس ترین فریضہ انجام دیتے تھے اور پھر بھی الگ رہتے تھے اپنی اپنی وراثتوں کے ساتھ تو پھر یہ کہاں ممکن تھا کہ آدمی خدا میں مل سکے ایک ہو سکے یہ نظریہ وحدتِ وجود سب غلط تھا یکسر محبوب سے مکمل وصال ناممکن۔

اوہ خدا۔ گزری ہوئی زندگی کیسے برباد ہو گئی۔ وقت کا کوئی بدلہ نہیں"
اس نے بازو اپنے سر سے بلند کئے۔
وہ وقت کی صلیب پر مصلوب تھی۔ ایلی ایلی لما سبقتنی۔ ایلی ایلی لما سبقتنی۔
آئینے میں اس کو اپنی صورت بجھی بجھی بے بضاعت دکھائی دی۔ "آئینہ حقیقت"
زریں تاج پکارتی ہوئی آواز اسے بہت قریب سے اپنے پیچھے سنائی دی اس ہنگام بادہ ہیں
محمد علی بار فروش ہنسا۔ اس ہنسی میں طنز نہ تھا تکلف نہ تھا۔ یہ بہت کچھ جانتی ہوئی
اور پھر بھی معصوم تھی۔
"چاند بہت دیر میں نکلا ہے" اس نے بات کرنے کے لئے بات کی۔
سوگوار اور جھجکی سی وہ آنکھیں جھپکائے بنا اسے دیکھتی رہی۔ جیسے وہ کہیں زمین کی گہرائیوں
سے اٹھ کر آیا ہو۔ ہوا نے اسے جنا ہو فضا نے اسے اگل دیا ہو۔
"ام العالم"
"تم مجھے کیوں پکارتے ہو۔" اس نے ایسی آواز میں کہا جو اس کے ہونٹوں کو بھی نہ چھو سکی
"قرۃ العین"
بھلا وہ کیوں اسے یوں پکارتا تھا وہ اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک تو نہ تھی اور کاظم رشتی کو اس
جہاں پر سے گزرے زمانے گزر گئے تھے۔
"طاہرہ"
"علی محمد باب بھی نہیں تھا جس کی حرف حی وہ تھی وہ اسے کیا کہتی ماکو بہت دور تھا"
"زریں تاج"
توازن برقرار رکھنے کی کوشش میں اسے غش آ گیا۔ تحفظ کے ایک گہرے احساس کے
ساتھ اس کی روح جاگی جیسے اس نے نیا عرفان حاصل کر لیا ہو۔ مکمل اور جاودانی سکوت نزوان
جس میں بھٹکتے رہنے کی کیفیت ختم ہو چکی وہ اپنی منزل پر تھی۔ پتہ نہیں وہ کتنی بار پیدا ہوئی
اور مری تھی تاکہ ان چکروں سے رہائی پا سکے۔ موت کے تاریک دریا کے کناروں پر اس
کی کشتی ڈوبی اور ابھری تھی کہ پار اتر سکے۔
"زریں تاج" یہ سرگوشی ایک سسکی تھی جیسے مل کر روحیں ماتم کریں۔
"محمد علی بار فروش" نے اسے حوض کے کنارے بٹھا دیا جس کی زمردیں سطح پر چاند

تیر رہا تھا جیسے آئینے میں کوئی چہرہ۔ یہ عجیب بات تھی کہ روحوں کے اس بے پناہ ہجوم میں ان دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا۔ مکمل خوشی لفظوں کی محتاج نہیں ہوتی۔ اسے کیا پتہ تھا کہ ان بیس دنوں کی اکیس راتوں میں وہ سرگرداں پھرا ہے بے خواب آنکھوں سے اس کی آرزو میں گھوما ہے۔ اسے پکارتا پھرا ہے۔ تنہائیوں میں اپنی تمناؤں کا بوجھ اٹھائے اور اب اس چشمۂ حیوان سے سیر ہو کر آبِ حیات پینے کے بعد اسے اور کس شے کی ضرورت تھی؟ انہی راہوں سے اسے واپس جانا ہے کیونکہ وہ زندۂ جاوید ہو چکا تھا۔

جھک کر اس نے زرین تاج کے پاؤں چھوئے اور بنا کچھ کہے ایک خواب میں دیکھی صورت کی طرح اونچے درختوں کے گہرے سایوں اور تاریک رات میں گم ہو گیا۔ ہوا نے اپنا سبزی لبادہ پہن لیا اور زرین تاج۔ زرین تاج پکارتی شاہ رود سے ماکو کے درمیان تیزی سے روانہ ہوئی۔ کیونکہ جو اسیر تھا وہ اس کا محبوب تھا اور جو اسیر نہیں تھا وہ بھی محبوب تھا۔ سارا جہان بے رنگ و بو تھا اب کیا بنے گا؟ اس پر ہنسی کا دورہ سا پڑا۔ کیونکہ خیمے کی دیواریں اور اونچی چھت اور بڑے بڑے طغرے خود اس کا وجود سب ہنس رہے تھے۔ انہوں نے بڑے عظیم الشان لقب خود اختیار کر لئے تھے اور گویا بڑی بڑی پناہ گاہوں میں تھے۔ اب ایک رات میں رات کی چند گھڑیوں ایک انسانی سلطنت کی دیواروں کو مسمار کر دیا گیا تھا گویا غنیم کی فوج طاقت ور تھی اور شبخون مارا تھا۔ اب کیا بنے گا۔ غصے سے اس کے منہ سے کف جاری ہو گیا۔

مومنین خیمۂ مشاورت میں جمع تھے اور ان دونوں کا انتظار ہو رہا تھا۔ ریزہ ریزہ وجود کو سمیٹ کر اس نے سفید لباس پہنا۔ طاہرہ کا لباس۔

"کافیہ معلوم کرواؤ کیا جنابِ قدوس تشریف لے آئے ہیں۔"

جنابِ قدوس آج مجلسِ مشاورت میں نہیں آئیں گے" وہ باہر جا کر فوراً پلٹ کر یہ جواب لائی کیونکہ ایک مومن جانے کب سے اس اطلاع کے ساتھ منتظر تھا۔

"انہیں میرا سلام کہو ہم مجلسِ عام میں جانے سے پہلے ان سے ایک ضروری مشاورت چاہتے ہیں"

وہ نہایت بے چین خیمے میں کھڑی رہی پھر بیٹھ گئی اس نے گزری رات کو ایک بڑے خواب کی طرح جانا تھا۔ بھنچی ہوئی مٹھیوں میں انگلیوں کے جوڑ زرد تھے۔ گویا کسی نے سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ اس تماشے کی حقیقت کیا تھی؟

اس کے قوسِ زندگی میں یہ صعود تھا یا تنزل؟

یہ گناہ تھا یا ثواب؟

پھر گناہ و ثواب کیا ہے اگر حروف حیٰ منزہ ہیں اور معصوم ہیں۔ اگر وہ معصوم ہیں تو اسے بے قراری کیوں ہے؟

وہ ابھی تک ایک عام عورت تھی؟ کانپتی ہوئی سہمی ہوئی کبوتری کی طرح گھبرائی ہوئی تو اس مذہب کی جڑیں کہاں ہیں۔

وہ بے پردہ اپنے باغ سے نکلی اور جناب قدوس کے خیمے کی طرف چل دی۔ مشاورت کے خیمے میں جہاں ان کا انتظار ہو رہا تھا۔ وہ سب جمع تھے۔ اس کے بے پردہ ورود کا سن کر سب باہر نکل آئے۔ اس قیامت کے لئے تو کوئی بھی تیار نہ تھا۔ "باب" کے پیروکار اس پر جان نثار کرنے والے۔ بڑے بڑے القابوں کے متمنی ترقی کرتے ہوئے زینہ بہ زینہ اندرونی دائرہ کی طرف سفر کرتے ہوئے لوگ نئے مذہب کی آڑ میں سلطنتوں کے بادشاہتوں کے جنون میں مبتلا لوگ۔ وہ جو اپنی جانیں قربان گاہ پر رکھ چکے تھے اور منتظر تھے۔ اس کے پیچھے پرانی شریعتوں کی منسوخی پر دستخط کرنے اور اسے دل سے قبول کرنے کے باوجود وہ سخت مضطرب تھے اور شور مچا رہے تھے۔

صبح ازل کے خیمے سے بڑے بھائی بہاء اللہ ایک لوح لے کر نکلے جس کی تلاوت کرنے کے لئے انہوں نے نہایت خوش آئند حافظ سے کہا۔ یہ سورۃ ملوک تھی۔

بارفروش کے خیمے کا پردہ اٹھا کر وہ بے جھجک اندر داخل ہوگئی۔

"زرین تاج" اس نے نہایت حیرت سے کہا۔

"ہاں میں۔ محمد علی میں"

جناب قدوس کا رنگ زرد تھا آنکھیں جھکی ہوئیں جیسے گرد سفر اس کے وجود کے اندر اتر گئی ہو۔ "خدا کے لئے تم چلو۔ مومنین کیا کہیں گے یہ ساری عمارت جس کی بنیادوں میں معصوم لوگوں کا خون ہے تم نے گرادی ہے" وہ اپنے سر کو ہاتھوں میں پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"نہیں" اس نے سر ہلایا "اب کہیں بھی جانا ممکن نہیں رہا۔

دور سے برابران کے بیان یا ایقان کی تلاوت کی آواز آرہی تھی۔ جیسے شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ ہو۔ جیسے خاموشی میں چشمے کے بہنے کی آواز ہو۔ جیسے ویران محلوں میں آہستگی سے ہوا گزرے۔ دور کہیں بڑی شاہراہ پر قافلوں کے گزرنے کی صدا ہو۔ مکمل ہم آہنگی سے ان کے

دل دھڑک رہے تھے۔ اس واقعے کو ہونا تھا کیونکہ کتابوں میں ایسا لکھا تھا۔ یہ ہونا تو قضا و قدر سے مقدر ہو چکا تھا۔ یہ نہایت اہم سانحہ جس کے متعلق پیشین گوئیاں کی گئی تھیں، جب کہ نہایت خاموشی سے وہ نئے مذہب کے اصول و قانون وضع کر چکے ایک تشنۂ وضاحت مسئلہ یہ بھی تھا کہ اس عجیب تر واقعے کا ایسے موقع پر ہونا کسی خاص واقعے کا ظہور کوئی وجہ۔ اگر یہ سب کچھ مقدر تھا تو پھر گناہ کیا ہے؟ جناب قدوس گناہ کیا ہے؟

"ہم تو گناہ سے پاک ارفع و اعلیٰ رہ چلیں ہیں"

باہر ساری خلقت جمع کئے تھی وہ چاہتے تھے معلوم کریں کہ جنابِ طاہرہ کا بے پردہ آنا کیا اس شجرِ حقیقت کے حکم سے تھا؟ وہ زور زور سے آہ و زاری کرتے تھے یہ ان کی برداشت سے باہر تھا۔ صبحِ ازل نے ایک لوح نازل کی۔ آج نہایت مقدس دن تھا روزِ عید کیونکہ جنابِ قدوس اور جنابِ طاہرہ سورج اور چاند ایک جگہ جمع ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک خیمے میں نزولِ اجلال فرمایا تھا۔ درمیانی باغ کے حوض میں اگلی رات بھی زمردیں آئینے میں پچھلی راتوں کا ماہتاب منعکس ہوا مگر شور و غوغا سن کر چھپ گیا۔ یہ عیدِ نوروز سے بھی بڑھ کر ہنگام مسرت تھا۔ شراب تقسیم کی گئی رامش و رنگ اپنی بہار پر تھا۔ سازندوں نے سازوں پر نغمے الاپے۔ سبزے پر زندگی کے پھول کھلے۔ صحنِ گلشن میں ناچنے والوں نے شادیانوں پر رقص کیا۔ بدشت کی شاہراہوں پر دیوانوں کی طرح قافلے بدمست ہو کر سیر کو نکلے۔ گناہ و ثواب کی تمیز اٹھ گئی تھی۔

باب نہم

چہریق سے اسے وہ تبریز لائے تھے اور انگریز ڈاکٹروں کی نگرانی میں اس کا معائنہ کیا جانے والا تھے۔ وہ دیوانہ تھا یا فرزانہ۔ اس کی وجہ سے ملک کے طول و عرض میں شورشیں ہو رہی تھیں لوگ ان کی شدّت کی وجہ سے پریشان تھے۔ وہ بستیوں پر حملہ کرتے اور اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے میں بہت سخت تھے شدید تھے انتہاپسند۔

بدشت میں مجلس مشاورت اس ہنگامۂ مسرّت کے بعد اچانک ختم کر دی گئی اور سارے بابی تیزی سے اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف بھاگے "باب" کی رہائی کے لئے حکومت سے ٹکر لینے کی کوئی عملی تدبیریں شروع ہوں۔ "قدوس اور طاہرہ" اپنے ہودے میں تھے جس کو حجلۂ عروسی کی طرح مزیّن کیا گیا تھا۔ کیا وہ خوش تھی بالآخر۔

بڑے بڑے مسائل پر بحث کرنے اور فقیہوں کو شکست دینے والی زبان آج چپ تھی۔ پلکیں اٹھتیں اور سیاہ جھالروں کی طرح ان چھلکتے پیمانوں پر ڈھک جاتیں۔ پورا وجود رہ رہ کانپ اٹھتا جیسے موت کہیں قریب ہو۔ کیونکہ عشق موت کی مانند زبردست ہے۔ چہرہ بہ چہرہ روبرو کتنے حجاب حائل تھے۔ بھلا تابِ نظارہ کسے ہے؟

اب جب کہ عبادتوں کے راز افشا ہوئے تھے۔ شاہدِ مقصود نے اپنے چہرے سے کثرت کے پردے اٹھائے تھے۔ شرابِ طہور کے اثر سے وہ مدہوش ہو گئی تھی۔ کیونکہ تابِ نظارہ نہیں تھی اب نظارہ درمیان تھا پر وصل ادھورا تھا۔ اس کی جانِ بے تاب کو پتہ چلا تھا کہ وہ کبھی سیراب نہیں ہو گی جب تک کہ اس کی ہستی ہے وہ ہے۔ وہ ام سلمٰی۔ زرین تاج۔ قرۃ العین۔ طاہرہ۔

جس فلسفے کے سہارے وہ اب تک چلتی آئی تھی اس کا عملی مقصد فنافی الذات ہونا تھا۔

وہ آغاز کی طرح انجام میں بھی بھٹک گئی تھی۔ جیسے زمستان میں برف راستوں کو معدوم کر دیتی ہے۔ یہ فلسفوں کی گرد بھی اتنی اڑی تھی کہ سب کچھ ڈھک گیا تھا نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا جب اس نے محبت کا سہارا لینا چاہا تب بھی کچھ اس کے ہاتھ نہیں آیا۔ وہ جو اس کا محبوب تھا۔ ماکو میں اسیر تھا اور وہ جو اس ہودے میں اس کے ساتھ تھا؟

اسے تو ذات قائم سے عشق تھا۔ قائم جو ظہورِ ذاتِ خداوندی ہوا اور یہ بھی اپنے آپ کو ظہورِ ذات کہتا تھا۔ ذات جو سارے احاطوں سے ماوراء تھی۔

قدوس آقا تھا کہ سب کی جانوں پر اس کا تصرف تھا۔ مالک حقیقی جس کی ذات سب میں جاری و ساری تھی۔ وصل پیام اجل تھا کہ اب اس کی اپنی کوئی ہستی نہ رہی تھی۔ وہ کہیں نہ تھی سب طرف وہی تھا وہ اس کی وجہ سے تھی۔ کائنات میں رنگ رنگوں میں چمک، چمک میں خیرگی وہی تھی اور ہوائیں اس ہودے کے گرد گھوم کر فنا۔ فنا۔ فنا کے راگ گاتی تھیں۔ بالآخر موسیقی کے سمندر میں سے جو اس کی روح کو ننھے قطرے کی طرح ہکورے دیتا تھا جھاگوں میں اڑاتا تھا یہ لمحہ برآمد ہوا تھا۔ لمحہ جس کے اندر کائنات تھی جو ہر ذات تھا مکمل آہنگ تھا جو ابد تا ابد پھیلا ہوا تھا۔ اس لمحے کی تلاش میں وہ کہاں سے کہاں تک نکل آئی تھی۔ گناہ و ثواب۔ ذرا ذرا سے کپکپانے والے ڈر کہیں بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ بس اور نگاہ نے سب کچھ دھو دیا تھا۔

قاچاری فوج کے سپاہیوں نے اسے گھیر لیا۔ وہ شاہ رود سے ہو کر آئے تھے جہاں سے ساری رونق اجڑ چکی تھی اور ٹوٹی ہوئی طنابیں بجھی ہوئی آگ اس کے گزرنے کا نشان باقی رہ گئی تھی۔ منزل مارتے گھوڑے دوڑاتے وہ چاروں طرف "باب" کے شورش پسند حامیوں کی تلاش میں نکلے اور نہایت آہستہ خرام ہودے کے گرد گھیرا ڈال لیا۔

وہ چاہتا تھا اس مکمل گھڑی میں نسیم سحر کے جھونکے بھی اسے نہ چھوئیں یہ یوم الست تھا اب جبکہ میثاق عہد ہو چکا اسے کوئی تکلیف کیوں پہنچے۔

محمد علی بار فروش نے پردہ اٹھا کر باہر نظر کی تو نقشہ بدلا ہوا تھا بھگدڑ مچ گئی جس کا منہ جس طرف اٹھا وہ ادھر بھاگ گیا۔ اس ہنگام رستخیز میں وہ بھی ہجوم میں غائب ہو گیا۔ باقی عورتیں بھی گرفتار ہو گئیں۔ وہ بھی پابہ زنجیر پایہ تخت لائی گئیں تاکہ شاہ کے سامنے حاضر کی جائیں یا دجان سے مار دیجائے۔

پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ وہ کسی عام شورش کی وجہ سے عام شر پسند کی طرح گرفتار کی گئی تھی راہِ محبت میں اس کی دونوں منزلیں ساتھ ساتھ شروع ہوئیں۔ دو مختلف سمتیں جو دراصل ایک

ہی سمت تھی۔ میثاق عہد محبت کے ساتھ آرزو اب باقی نہ تھی۔

وہ اس حقیقت سے جسے العامہ کہہ جاتا ہے آشنا تھی اور اس حقیقت سے بھی جس کو الاحدیہ پکارتے ہیں۔ اس کی خوشبو جو ہر شے میں خود تھا اسے چاروں طرف سے گھیرے تھی وحدتِ وجود تکمیل کا مطلب اس کا اپنا آپ بھی تھا اور اس کے گرد پھیلی دنیا سراپا پردۂ اسرار کے راز بالآخر اس کی سمجھ میں آ رہے تھے جو ہو چکا گذر چکا گزرے زمانے اس جاری وساری نغمے کی طرح تھے جو اس کے دل کے ساز پر بجایا جا تا رہا ہے اپنی ساری امانتوں کے ساتھ وہ اس میں مجتمع تھے جو "باب" تھا اور جس کے اندر وہ آپ اترا تھا۔ تکمیل بشر یہی وہ تھا جو کائنات کا بنانے والا اس کی خوشبو۔ کائنات کی آرزو محبت علم سب کچھ جو سازِ فطرت کی نوا تھا اس چہرے میں سارے جہان جمع تھے اور وہ اس سے اب بھی پوشیدہ تھا۔ وہ اب بھی اس سے الگ کیوں تھا؟ وہ جو موجودات کے بھی اندر تھا۔ اس سے چہرہ بہ چہرہ روبرو ہوگا؟ جانے کب ہوگا۔

وہ جو ہمہ رحمت تھا۔ محبت تھا۔ قادرِ مطلق تھا وہ اپنے بندے میں بھی آپ تھا۔ اور ہر ہنگامے میں بھی خود ہی پھر تشویش کی کیا وجہ؟ وہ باب تھا باب الباب تھا۔ قدوس تھا۔ طاہر تھا۔ ہر ایک کے اندر باہر وہی آپ جلوہ گر تھا۔ وہ دوست تھا اور اسے اتنی دور تک اس راہ پر لایا تھا وہ دشمن تھا اور اب اسے ذلتیں دے کر برباد کرنا چاہتا تھا۔ جیسے کوئی تیز ہوا کے رخ پر ذرات کو اڑائے۔ نہیں خود اس کے اندر وہی تھا۔ وہ خود بھی تو وہی تھی۔ یہ وحدت پتہ نہیں اس سے پہلے کیوں اسے سمجھ نہیں آئی۔ وقت کا ایک تسلسل جس میں دن رات، ماہ و سال زمان و مکان تھے۔ دائرہ امکان میں بندھے اور باقی کیا تھا وہ یہ سب تماشے خود دیکھ رہا تھا وہ زنجیروں میں جکڑی تھی اور سر جھکائے ہوئے اس مصیبت پر ہنس رہی تھی۔ بھلا دوست کی طرف سے جو چیز بھی ملے اس پر نازاں نہ ہوا جائے اس کا سر فخر سے بلند ہو گیا۔

قاچاری دربار شان و شوکت میں صفوی دربار کا مقابلہ تو نہیں کر سکتا تھا۔ وہ خالص جاہ و جلال تھا۔ جس میں کوئی خوف کی آمیزش نہ تھی مگر قاچاری سلطنت جس کے دروازوں پر دوسری طاقتیں دستک دے رہی تھیں اپنے گھر میں بھی غیر محفوظ تھی۔ ہر شورش کو ہر فتنے کو ہر آواز کو کسی اجنبی طاقت کا اشارہ سمجھا جاتا تھا۔ جب حکومتیں شک و شبہ میں گرفتار ہو جائیں اور انہیں اپنے پر یقین نہ رہے۔ وہ آمدنی کا بیشتر حصہ سراغ رسانی پر

صرف کرتی ہیں اور وفاداری بھی بزورِ شمشیر حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ جب پاؤں کے نیچے سے زمین نکلتی محسوس ہوتی ہے اور وہ غیر مرئی سہاروں کی تلاش میں ہوتی ہیں۔ شرمندگی کو مٹانے کے لئے وہ ہر سائے پر لپکنے لگتی ہیں۔ شہ زور اپنے دشمن کو برداشت کر لیتا ہے کیونکہ اسے اپنے مدِمقابل کے سامنے اپنی طاقت کا احساس ہوتا ہے کمزور حکمران معاف کر دینے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ برداشت کرنے اور رواداری کے سلیقے سے بھی محروم ہوتے ہیں۔ وہ کسی کونے سے اٹھتی آواز کو بھی فتنہ سمجھ کر اسے اپنے لئے خطرہ سمجھ لیتے ہیں۔

مگر اپنی بکھری سلطنت کے مرکز میں بیٹھے قاچاری سلطان کے چہرے پر حسرت اور مسرت کا ایک سایہ سا گزرا۔ وہ اس عورت کو جو عروسِ نو کی طرح تازہ اور پر بہار لگتی تھی دیکھا کیا وہ عورت دربار کی شوکت سے مرعوب ہوئے بنا شاہ کی طرف بے حجابانہ دیکھتی رہی "تم شاہ عالی وقار کے دربار میں ہو آنکھیں جھکاؤ" حاجب نے زیرِ لب کہا۔

لمبے بکھرے بالوں کو سر کی ایک جنبش سے رخِ زیبا کو ایک ادا سے اس نے نہایت لاپرواہی اور ایک پُر وقار غرور سے جھٹک کر بادشاہ کی طرف دیکھا۔ وہ ملا صالح کی بیٹی ملا محمد کی عروس اور قزوین کی سرزمین کا حسن تھا۔

درباری اپنی اپنی نشستوں پر آنکھیں جھکائے گرجتی ہوئی آواز سننے کے متمنی تھے مگر حاجب کو بادشاہ نے اشارے سے الگ ہٹ جانے کو کہا۔

"بگزارید کہ روئے زیبا دارد"

علما جو آج بطورِ خاص بحث مباحثے کے لئے تیار ہو کر آئے تھے بہت پریشان ہو گئے یہ روئے زیبا جو مشہد سے لے کر شیراز تک نجف اشرف سے لے کر کربلائے معلیٰ تک پرانے سبق بھلانے میں "باب" کے لئے ایک وسیلہ تھا اور یہ روئے زیبا جو اپنی جھلک آپ دیکھنے کے لئے کوچہ گرد تھا۔ ہاں یہ عورت بلاؤں اور آندھیوں میں بھی اپنا چراغ لے کر حجابوں کے آر پار اسے ڈھونڈتی پھر رہی تھی جو اس کا خدا تھا۔ پتہ نہیں وہ اپنے خدا کو محبوب کہتی تھی کہ محبوب کو خدا۔

یہ کفر و الحاد کی کونسی منزل تھی؟

کیا خدا محبت تھا؟

اگر خدا سے محبت کی جائے تو ان سب اشکال کا کیا کیا جائے وہ سارے وجود

جن میں وہ جلوہ گر ہے؟

خدا سے محبت کرنے کے لئے کیا ضروری نہیں کہ اس کا نام لیا جائے۔ یہ خالق و مخلوق کا رشتہ بھلا کر آدمی کہاں جا سکتا ہے؟ آخر آدمی کی بساط کہاں تک اس بار کی متحمل ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے اور خدا کے درمیان ایک ان دیکھا رشتہ محسوس کرے۔ ملاؤں اور تعلیم دینے والوں اور مجتہدوں کے بنا۔

قرۃ العین جو سید کاظم رشتی کے خطوط سے پہلے ام سلمیٰ تھی۔ "باب" سے ملنے سے پہلے قرۃ العین تھی۔ محمد علی بارفروش سے ملنے کے بعد زرین تاج تھی اور بدشت کانفرنس کے بعد طاہرہ ام العالم تھی رہا کر دی گئی۔

"باب" تیس اکتیس سال کی آتش زیر بار رکھنے والی عمر میں پورے ایران میں آگ لگا چکا تھا اس کے مومنین اپنی سخت نفرتوں کو جو انہیں باقی جہان سے تھی انقلاب کے لئے کوشاں تھے ایک غیر محدود انتھک جذبۂ عشق انہیں لئے لئے پھرتا تھا۔ وہ بڑے جرات مند دلیر اور نڈر تھے "باب" کے لئے وہ جان سے گزر جانا عین ثواب سمجھتے تھے۔ "باب" جوان کا خدا تھا اور اس عمر میں جب وہ بیان کو ختم بھی نہیں کر سکا تھا۔ وہ ماکو سے چہریق کے قلعے میں لایا گیا۔ شورشیں روز بروز بڑھتی گئیں۔ "باب" کے مقلدوں کی نوا تیز اور تلخ ہو گئی۔ زنجان، ماژندان اور خراسان میں فتنے اور غوغا اپنے انتہائی عروج پر تھا۔ انہوں نے اس شعلہ نوا شاعرہ کو محمود خاں کلانتر کے گھر میں قید کر دیا اور "باب" کو چہریق سے تبریز لا کر جہان سے گزار دیا۔

چھ سال کے عرصے میں اس کے مقلدوں نے طبرسی کو ایک قلعے کی طرح مضبوط بنا لیا تھا اور اس میں بند ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ یہ حسن بن صباح کے الموت کی تقلید میں ناقابل تسخیر تھا۔

ناصر الدین قاچار اپنے اجداد کی طرح کثرت ازدواج کا دلدادہ تھا۔ ایرانی غازے سے مزین حسن کی بے پناہ صورتیں اس نے اپنی آرزو بنا کر اڑا دی تھیں۔ اس نے میرزا تقی امیر نظام سے پوشیدہ ایک قاصد روانہ کیا جو شاہ کا خاص خط لے کر محمود خان کلانتر کے ہاں آیا تاکہ قرۃ العین سے ملے۔

وہ ترجمان الاشواق پڑھ رہی تھی جب سیڑھی لگنے کی آواز سے چونکی۔ محمود خاں کی بیٹی ماہ تاباں نہایت عجلت میں تھی اور سہمی ہوئی بھی اسے ام العالم سے محبت تھی۔

اور وہ اس کی خاموشی کے طویل وقفوں سے پریشان بھی ہو جایا کرتی تھی۔ عام عورتیں دعا کی طالب تھیں اور بہت رازداری سے جب قرۃ العین کے پاس آنا چاہتیں تو ماہِ تاباں ہی اذن چاہنے اس کپکپاتی سیڑھی کے راستے اوپر آتی تھی۔ امیر نظام نے سختی سے منع کر رکھا تھا اور کلانتر کو خاص ہدایات تھیں کہ وہ اس جادوگر عورت سے کسی کو بھی ہرگز کلام نہ کرنے دیا کرے۔ اسی لئے اسے ایک ایسے کمرے میں رکھا گیا تھا جو اس کی مناجاتوں دعاؤں مراقبوں کے لئے ایک حجرے کی طرح الگ تھلگ تھا۔ شام کا سورج مغرب کی طرف جھک رہا تھا اور رنگین شیشوں کے سائے اس خوشی پر لرزتے ہوئے خوش ہو رہے تھے جیسے شام رات سے ملتی ہے۔ رات دن سے ان دیکھی ساعتیں وقت سے گلے ملتی ہیں انسانی روح بھی اپنے خالق میں مل جاتی ہے۔ نہیں وہ تو پہلے ہی خالق حقیقی کا حصہ ہے وہ تو صرف جاگتی ہے جاگتی ہے اور اپنی اصل کو اپنے ممکنات کو پہچانتی ہے اسے عرفان حاصل ہوتا ہے جیسے یک لخت روشنی اسے آ لے۔

ماہِ تاباں نے ہولے سے کہا "مادرِ مہربان"

قرۃ العین نے اوپر دیکھا۔ "لاؤ خط مجھے دے دو"

"گھبراؤ نہیں بچی اگر شاہ نے خط بھیجا ہے تو تم پر تو کوئی الزام نہیں"

"مادر" کیا وہ ٹھہر رہا ہے۔

"آہ دوستو المخاطب کے پاس سے گزرو۔۔ لالع کی طرف مڑو تو رود یللملم کو تلاش کرنا کیونکہ وہ سب وہاں ہیں جن کے لئے میں نے روزہ اور سفر کی صعوبتیں اٹھائی ہیں زیارت کی ہے اور ہنگامے دیکھے ہیں۔

مجھے کبھی وہ سنجیدہ وعدے جو میں نے منیٰ کے الحاسب المنہر لالع اور زمزم پر کئے تھے نہ بھولنے دو کیونکہ ان کا کنواں میرا خون قربانگاہ میری روح اور ان کی کنکریاں پھینکنے کی جگہ میرا دل ہے ساربان اگر تم الحاجر کی طرف آؤ تو اونٹوں کو ذرا اوپر روکو اور سلام کہنا۔

ان خیموں کی طرف جو چراگاہ میں نصب ہیں میری آرزوؤں اور تمناؤں کا سلام جن کی وجہ سے میں سخت بے چین ہوں۔

اس نے کتاب الگ رکھ دی اور ریشمی کیسے میں سے تہہ شدہ معطر کاغذ نکال کر پڑھا

"اگر تم "باب" کے مذہب سے توبہ کر لو تو عنایاتِ بے نہایت مراتب اعلےٰ تمہارے

لئے چشم براہ ہیں"۔

"مراتب" کیا اب مجھے مراتب کی ضرورت ہے؟"

ماہِ تاباں اس نے کہا "کیا انسان تھک سکتا ہے؟"

"نہیں" مادر اس نے بے ساختہ کہا۔

ہاں جب ایک راہ پر انسان بہت دور نکل آتا ہے تو وہ لوٹنا نہیں چاہتا۔ منزل قریب ہو تو بھلا کوئی کیوں لوٹے گا اب کیا رہ گیا ہے۔ جو جاگتا ہے وہ کیوں سوئے گا!

"تاباں" کو اس قیدی عورت کی صورت بہت اچھی لگتی تھی۔ اتنی بڑی بڑی آنکھیں جن کی نگاہ دل کے اندر اتر جاتی تھی۔ نحیف جسم عبادت کی زیادتی سے گھلا ہوا آواز شفاف آئینے کی طرح جھلملاتی ہوئی پُر جذبات جیسے ارغنون۔ اور سوچتی ہوئی کہیں دور کسی اور جہان میں بستی ہوئی جیسے وہ کہیں اور ہو۔ وہ بہت کم کھاتی تھی جیسے ہمیشہ روزے سے ہو اور پھر بھی اس کے وجود سے ایسی تپش نکلتی تھی کہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا نہیں جاتا تھا نظر اس کے جلال سے مدہوش ہو جاتی تھی۔

اس کاغذ کی پشت پر اس نے لکھ دیا اور اسے اسی طرح ریشمی تھیلی میں بند کر کے تاباں کی طرف بڑھا دیا۔

ترجمان الاشوق اٹھا کر اس نے پھر پڑھا۔

اگر وہ سفر کریں گے تو ان کا سفر کرنا مبارک ہوگا اور اگر ٹھہر یں گے تو ان کا ٹھہرنا مبارک ہوگا۔

پھر آخری دھوپ کی کرنیں احمریں رنگ میں ڈوبی ان لفظوں پر پڑیں اور کتاب خون میں ڈوب گئی۔ ذرات کروڑوں رودِ زندہ کی طرح بہے چلے جاتے تھے۔ محبت کرنے والے دل کا کام متوجہ کرنا نہیں یہ مشیت کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ آدمی کا ارادہ اسے اس سے آگے نہیں لے جا سکتا۔ جیسے آئینے میں خیال کی پرچھائیں گزریں۔ ایسے ہی آدمی گزرتا ہے۔ کبھی کوئی ذرہ بڑے سے خام ہیرے کی طرح دھوئیں کے اس بادل میں مرغولے کے ساتھ پیچ در پیچ فضاؤں میں لڑھکتا ہوا آتا ہے۔ دھارے سے الگ ہوتا ہے۔ تیرگی کو اپنی خیرگی سے جلا بخشتا ہے اور پھر لہروں کے ریلے میں بہنے لگتا ہے اس رو میں جس میں نہ دن ہے اور نہ رات جس کو لوگ زمانہ کہتے ہیں ہر زمانے کے نصیب میں ایسی چمک نہیں ہوتی۔

ناصر الدین قاچار بہت بے چینی سے قاصد کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ شام تیزی سے رات میں بدلتی جا رہی تھی۔ محل کی چھت پر مؤدب خادموں اور لاتعداد غلاموں کی حاضری اس کے حضور قلب میں حارج ہو رہی تھی۔ اس نے سب کو چلے جانے کا حکم دیا۔ ستاروں کی روشن آنکھیں اسے تک رہی تھیں۔ جیسے انہیں اس کی بیتابی پر ہنسی آتی ہو۔ رات اپنی سیاہ ردا اوڑھے ایک لاچار ماں کی طرح آہستہ خرام اس کے گرد گھوم رہی تھی گویا اسے بچانے کی کوئی تدبیر نہ کر سکتی تھی۔

چنگیز خاں کو اس کے شامانوں نے نصیحت کی تھی کہ طویل عمر کا راز زنگی زنگانی عورتوں کی صحبت سے دوری ہے۔ مگر ایلیخانیوں کے جدّ امجد اور جھیل بیکال سے اٹھنے والے گرد باد کے طوفانوں کے حکمران نے ان کی بات کو سنا ان سنا کر دیا تھا۔ عورتوں کا کام گھر کا بار اٹھانے بچوں کو پالنے، سردی گرمی کے کپڑے بننا اور قبیلوں کے لئے جنگجو سپوت مہیا کرنے کے سوا بھلا کیا تھا غلام لڑکیاں ناچتی گاتی اور سامانِ عیش ہی تو عیش دل بہلا دے۔ اور سلطنتیں چھیننے کے ساتھ جب ان سے گھر بار کا بوجھ بھی سمیٹ لیا گیا تو وہ بس عیش کا سامان رہ گئیں اور پھر ہر لے ہوئے وہ سامان عیش بھی نہ رہیں۔ زندگی میں ان کا کوئی مقام ہی نہ تھا۔ اگر کسی عورت کی بہت عزت افزائی کی جاتی تو بادشاہ اسے حرم کی زینت بنا لیتا۔

آسمان پر سرخی مٹ جانے کے بعد بھی جو سفیدی باقی رہ جاتی ہے اس میں اپنے خط کا جواب ناصر الدین شاہ نے پڑھا۔

تو و ملک و جاہ و سکندری ۔ من و رسم و راہِ قلندری
اگر آن نکواست تو در خوری ۔ دگر آں بد است مرا سزا

اس نے خط کو پرزے پرزے کر دیا۔ اس کا جی چاہا اس بادشاہت کا کیا فائدہ جس کو قلندری ٹھکرا دے بھلا وہ کس لئے بادشاہ تھا؟ اسی لمحے امیر نظام نے باریابی کی اجازت چاہی۔

شاہ کے سامنے کی زمین چوم کر اس نے کہا "طبرسی میں جنگ زوروں پر ہے اعلیٰ حضرت کیا حکم دیتے ہیں" "بابی فتنہ سے نبرد آزما ہوا جائے"

بالکل انہیں یکسر کچل دو۔ ان کا نام و نشان مٹا دو۔ خدا اور بندوں کے درمیان فتنوں کو ہوا دینے کا جرم ناقابل معافی ہے۔

امیر نظام کے جانے کے بعد شاہ اپنی جذباتیت پر خود حیران رہ گیا۔ وہ نرم خو حکمران تھا اور عورتوں کے معاملے میں تو بہت ہی دریا دل تھا۔ اسے وہم تھا کہ عورت کو جان سے مارنے کا نتیجہ

کبھی اچھا نہیں ہوتا۔ کیا وہ طاہرہ سے ایک ملاقات خود نہ کرے ؟ ناچتی ہوئی کنیزیں اور تیز فانوسوں کی روشنی اسے چبھ رہی تھی ۔ وہ الگ سے تنہا بیٹھ کر کوئی حل چاہتا تھا۔ خونریزی کے بنا۔ سہولت سے ۔ اس مسئلہ کا حل مگر بادشاہ اپنی جگہ مجبور محض ہوتے ہیں ۔

بہت سوچ بچار کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ جب امیر نظام طبرسی کی طرف کوچ کرے اور مصروف ہو۔ وہ طاہرہ کو بچانے کی ایک اور کوشش کرے گا۔ جیسے اس کے ذہن سے ایک بوجھ اتر گیا ہو۔ ایلخانی باغ کی طرف اس کی سواری نکلی ۔

روشوں پر ہوا سے اڑ کر بکھری ہوئی پتیاں پھولوں اور رنگوں خوشبوؤں اور گذشتہ دنوں کی بہار کے شباب کی داستان سناتی تھیں ۔ کلانتر کے گھر سے طاہرہ کو لایا گیا ۔

اب جب کہ وہ روبرو تھے ناصرالدین شاہ پتہ نہیں کیوں گھبرا رہا تھا۔ محلات یا باغوں میں حسین ترین کنیزوں کے جھرمٹ میں گھرے رہنے کے باوجود اسے بے نیازی کی اس ادا سے جوادانہ بھی کبھی" واسطہ نہیں پڑا تھا اسے لفظ نہیں مل رہے تھے وہ اس سے کیا کہے " مجھے کیوں بلایا گیا ہے" القابوں کے بنا کسی خوف کے یہ عجیب طرز تخاطب تھا آج تک کسی نے اس کے سامنے کی زمین کو بوسہ دیے بنا اس سے بات نہ کی تھی۔ کیا تم " باب" کے مذہب سے تائب نہیں ہو سکتی ہو؟ میں تمہاری جان بخشی کا وعدہ کرتا ہوں ۔

" یہ جان آخر جان آفریں کے حوالے کرنا ہی تو ہوگی۔ زود یا بدیر"

" دیوانگی کی زندگی کوئی زندگی ہے "

بادشاہ پتہ نہیں تم دیوانگی کسے کہتے ہو اور ہم دونوں میں سے کون دیوانہ ہے۔ میں تمہیں اپنی طرف بلاتی ہوں۔ کیا ظہور آل محمد کا وقت نہیں تھا کہ تم اس سے انکار کرتے ہو۔ کیا وعدے پورے نہیں ہوئے ایران اب مذاہب عالم کا سرتاج بن گیا ہے ۔

ان باتوں کو دہرانے سے فائدہ ۔ تم نے اپنے دین قدیم کو چھوڑا اس میں کیا برائی ہے"

" ناصرالدین کیا دنیا فسق و فجور سے بھر نہیں گئی کیا محض اپنے کونے میں بیٹھنا کافی ہے۔ جب تمہارے گرد سب کچھ تباہ و برباد ہونے والا ہو۔ دیکھو نئی دنیا عالمی مذہب تمہارے دروازے پر دستک دے رہا ہے"

شاہ نے سر جھکا لیا۔

میں تمھیں باب کی طرف بلاتی ہوں تم اپنی گمراہی سے باہر آؤ۔ تمہارا مذہب ایک قیامت کے بعد اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے ۔

"لے جاؤ اس زبان دراز اور گمراہ عورت کو لے جاؤ" شاہ روشوں پر تیزی سے ٹہلنے لگا وہ اسے بچا نہیں سکتا وہ دیوانی تھی اور اپنے حسن اور عقل کے باوجود جس مقام پر تھی۔ وہ نفرت اور پاگل پن کا مظاہرہ تھا۔ بھلا مذہب کبھی یوں پھیلائے جاتے ہیں؟ ملاقات ختم ہو گئی۔ جب سپاہی اسے کلانتر کے گھر لے جا رہے تھے وہ اپنے خیالوں میں گم سر اٹھائے تھی۔ پھر اس نے مسکرا کر اوپر دیکھا اور کہا "بزن بزن" محافظوں نے دیکھا کوئی بھی تو نہ تھا۔

ماہِ تاباں نے اپنی ماں کو بازوؤں میں جکڑ لیا۔ وہ واپس آ گئی ہیں ام الحالم اور میں ڈر رہی تھی کہ جانے وہ انہیں جان سے ہی نہ مار دیں کہیں اور نہ لے جائیں۔ ہائے اماں اس کے نہ ہونے سے گھر کتنا اداس ہوتا ہے۔

چپ رہو دختر کچھ مت کہو کیا تمہیں اپنے گرد و پیش سے خوف نہیں آتا۔

اگلے دن سنا گیا شاہ پر قاتلانہ حملہ کیا گیا تھا مگر وہ بال بال بچ گئے تھے۔ ملک کے طول و عرض میں شکرانے کی نمازیں پڑھی گئیں۔ دعائیں کی گئیں۔ نیازیں دی گئیں۔ شاہ کے معجزاتی طور پر زندہ رہنے کی خوشی منائی گئی۔ کلانتر کے گھر میں چراغاں ہوا۔

ماہِ تاباں جب نماز کے بعد اوپر گئی تو اس نے اطلس کا لباس پلنگ پر بکھرا دیکھا۔ عروسی پوشاک جو صرف ایک بار پہنی جاتی ہے اس کی سفیدی پر نگاہ نہیں ٹکتی تھی اور کمرہ خوشبوؤں سے مہکا ہوا تھا۔ گویا صبح عید ہو۔ آسمان بھنور بھرا گرد آلود اور بگولوں میں گم تھا۔

"مادر بزرگ کہاں جا رہی ہیں؟"

"مجھے برہنگی سے سخت نفرت ہے" وہ اس اقامت گاہ میں اپنی چیزیں سمیٹتی پھر رہی تھی "ماہ تاباں کو کچھ سمجھ میں نہیں آیا مگر وہ کھڑی رہی"

بابِ دہم

علی محمد باب - ملا حسین بشروئی - محمد علی بارفروش اور خود وہ امِ سلمٰی قرۃ العین ، زرین تاج طاہرہ پرکار کے چار نقطے تھے اور حضرت عیسٰےؑ کے پیچھے جو سرفروشانِ جہاں کے امام عالیمقام ہیں کھڑے تھے۔ وہ سب خرقہ پوش تھے - علم سے عقل سے اور دانش سے اپنی قربانی تک پہنچے تھے - وہ جو اپنے اور خدا کے درمیان اپنی ذات کو پردہ سمجھتے تھے اور نہایت بیقرار تھے کہ اسے اٹھا دیں - جنہوں نے سمجھا تھا کہ اگر انہیں اس کی واحدانیت کا اقرار کرنا ہے اس پر شہادت دینی ہے تو دوئی کو مٹ جانا چاہیئے ایک کمتر ذرہ ایک ذات بے ہمتیا بے مثل اور کل طاقت پر کیسے شہادت دے سکتا ہے ؟ اس کی واحدانیت پر اسے ہی تو کچھ کہنے کا حق ہے جو میثاق ازل کی رو سے اس سے مل جائے - آرزو رکھتا ہو اپنے اشواق میں شدید ہو - موت کی مانند زبردست ذرہ اپنی دلیل آفتاب سے لا سکے یہ کہ وہ آفتاب ہے اس کے اندر آفتاب کی تمام ممکنات پوشیدہ ہیں - جہانوں کی تخلیق کی ممکنات -

حضرت عیسٰےؑ کے پیچھے یہ لمبی قطار لمبی ہوتی گئی - وہ مشقت کو آزار کو کٹ مرنے کو مثلہ کئے جانے کو اس تربیت کی پہلی سیڑھی سمجھتے تھے جن میں جرأت اور بے پناہ دلیری آگہی تھی یہ آگہی جو انہیں بے قرار رکھتی تھی - یہ بیقراری انہیں ہر گھڑی موت سے قریب تر اس کے پہلو میں کھڑا رکھتی تھی - وہ اپنی جان سے گزر جانے کو ذرا سا سر جھکانا ہی تو سمجھتے تھے

ناصر الدین قاچار اس رات اکیلا اپنے محل کی چھت پر ٹہلتا رہا - وہ اس عورت کی شانِ قلندری اس کے استغنا اور موت کی خواہش سے نہایت مرعوب ہوا تھا - مگر وہ اس از خود رفتگی کو دیوانگی کے سوا اور کوئی نام نہیں دے سکتا تھا - عورت کے خواب اول شب کے خواب تھے - جن کی تعبیر کے

لئے فلک کو برسوں گھومنا پڑتا ہے اور پھر سارے بابی اپنے خداؤں کے بندی خانوں میں ہونے کی وجہ سے ایک بے آسرا بھیڑ بن گئے تھے بھٹکتے ہوئے۔ طبرسی کی شکست کے بعد انتہائی نا امیدی انتہائی نفرت اور اپنے مسلک پر اعتقاد کی انتہا نے انہیں پاگل بنا دیا تھا۔ ناصرالدین خوش قسمتی سے بچ گیا تھا۔ موت اس کو چھو کر گزر گئی تھی اور با خبر بابیوں کے مقدر پر اس واقعے کے بعد بطور ایک فرقے کے مہر لگ گئی۔ خود وہ اپنے انجام سے با خبر تھی۔ ناصرالدین کی نگاہ بھی اب اسے بچا نہ سکتی تھی۔

امیر نظام۔ ملا محمد جو اس کی موت کی شدید آرزو رکھتے تھے خود اس سے بھی بڑھ کر۔ ان کے سینے دہکتی ہوئی آگ سے بھرے تھے۔ سلطنت ایران کے لئے یہ خاتون عزت کا مسئلہ بن گئی تھی غیر ملکی سفیروں نے جو دربار میں موجود تھے اپنی سی کوششیں کیں کہ کم سے کم اذیت سے "باب" کے مقلدوں کو موت کے گھاٹ اتارا جائے مگر ان کی رائے صرف رائے ہی تھی کوئی ان کے لئے کچھ نہیں کر سکتا جو اپنے لئے کچھ نہ کر سکے تھے۔ جس طرح خس و خاشاک کو آگ لگتی ہے تو آسمان سرخی پکڑ لیتا ہے اسی طرح وہ بھی سلگتے رہنے اور سلگانے کی کیفیت سے کبھی دوچار نہیں ہو سکے بھڑک کر بجھ گئے اور خود اس کا مقدر تھا کہ اپنے چچا اور سسر ملا تقی کے قتل کے علاوہ شاہ قاچار کے قتل کی کوشش میں ملزم ٹھہرائی جائے۔

بوڑھے بلواچ نے اوغول نمالمش کو جو شہنشاہ اوغدائی کی بیوی اور چنگیز خاں کی بہو تھی۔ بغاوت کے الزام میں گرفتار کر کے سزا کے طور پر برہنہ کرنے کا حکم دیا مگر اس نے چیخ کر کہا تھا "تم کس طرح اس جسم پر نظر ڈال سکتے ہو جس کو ایک شہنشاہ کی نظروں کے سوا کسی نے نہیں دیکھا۔"

اور بلواچ نے جو منگولوں کا وزیر با تدبیر تھا۔ سمور میں سلوا کر اس کی پسلیاں تڑوا دیں اور پھر ڈبوئے جانے کا حکم دیا۔ خانوادے سے بغاوت کی یہ سزا بہر حال تھی اور منگولوں کی نگاہوں میں یہ ایک ناقابل معافی جرم تھا۔ بغاوت اور انقلاب اور نئے خیالات کی ترویج کے لئے بہر حال ان مقامات سے گزرنا پڑتا ہے۔ موت اردگرد منڈلاتی رہتی ہے۔ مقدر سے ٹکر لینے والے خواب دیکھنے والے ان راہوں سے گزرتے ہی ہیں۔

بالآخر حجاب اٹھنے کا وقت آ گیا تھا چہرہ بہ چہرہ روبرو ہونے کی ساعت وہ ساعت جس پر ہزار زندگیاں قربان کی جا سکتی ہیں۔

کشاں کشاں ان تاریک کوچوں میں سے وہ اسے ایلخانی باغ کی طرف لائے۔ ہوا چپ تھی فضا میں سناٹے گرج رہے تھے اور بجلی کے لہریئے کی طرح نقاب میں وہ نگاہ چہرہ جیسے رات کے

دامن میں لپٹا چاند ہو۔ بدبخت سیاہ حبشی شراب کے نشے میں مدہوش تھا جب سردار کل عزیز خاں نے اسے ٹھوکر مار کر جگایا اور حکم دیا کہ باغی عورت کا گلا گھونٹ کر اسے ہلاک کر دے۔

ہاں یہ خون کسی کی تو گردن پر ہو گا۔ یہ خون جس زمین پر گرے گا کیا وہ اس گرمی اتش کو برداشت کرنے کی قوت رکھتی ہے جو ان رگوں میں رواں تھا۔ تو جگہ جگہ اس آتش شوق سے آگ بھڑک اٹھتی تھی۔ وہ چوروں کی طرح سارے ایران کے طول و عرض میں چھپتی پھرتی تھی اور کوچہ گردی تھی کہ جس راہ کو اس نے چنا تھا اس پر بس چل سکے چلتی جائے۔ ایک لمحے کو بھی اس نے لغزش محسوس نہیں کی۔ کمزوریاں بڑی قربانیوں کی راہ میں حائل ہوئی ہیں۔ کیا یہ قربانی تھی مگر کس راہ میں کس لئے اور کیوں؟ یہ خون کس پر مباح تھا؟

حسین ابن علیؓ کا خون کس پر مباح تھا؟ گو بنو امیہ نواسۂ رسول کو شہید کرنے کی وجہ سے بدنام ہوئے۔ نجف اشرف۔ کربلائے معلیٰ اس ایک سر کی وجہ سے محترم ٹھہرے۔ حالانکہ بغداد میں تاتاریوں نے خون کے دریا بہائے تھے اور سروں کے مینار تعمیر کئے تھے۔ وہ سر جو رسولؐ کے کندھے پر تھا تو سارے جہان کو عزیز تھا۔ وہ سر جب کوفے کی زمین پر گرا تو اس کی قسمت جاگی۔ خاکِ کربلا مدینے کے بعد سب سے محترم ٹھہری۔ کبھی کبھار کوئی زندگی پوری دنیا کی زندگیوں کا حاصل ہوا کرتی ہے۔ کائنات اس کے لئے بنائی سنواری جاتی ہے اس ایک چہرے کا حسن پورے جہان کے حسن کا مقابل ہوتا ہے۔ حضرت یوسفؑ کا حسن ایک مکمل نور تھا اور وہ روئے زیبا مصر کے بازار میں بکا۔ بندی خانوں کے اندھیروں میں پوشیدہ رہا۔ پتہ نہیں اسرارِ جہاں کا کوئی حل ہے۔ اس راز سے پردہ کون اٹھا سکتا ہے اور سرا پردۂ امکان سے پرے حدِ امکان کے پار کیا ہوتا ہے؟ رد یا کیا ہیں؟

سرفروشی کی تمنا جو سر کو کندھوں کے لئے بار بنا دیتی ہے۔ بے پناہ آنکھیں جو یہ راز جانتی ہیں۔ بڑی سنجیدگی سے اپنے آپ کو خدا کہہ دیتی ہیں۔ پھر عشق کے شعلوں، پتنگوں اور صرصروں کی کشمکش ہوتی ہے۔ ناتوان ذروں کو حسنِ جاودانی ملتا ہے ذرے جو سجدہ گاہ قدسیاں ہیں

وہ سفید لباس میں لپٹی مسعد خوش اور منتظر تھی۔

اور "باب" واہو رہے تھے۔ انسان اس کی وساطت سے ہوا کی طرح گزر سکتا تھا ان بارگاہوں سے اکیلا سفر کرتا ہوا اس تک پہنچ سکتا تھا۔ اس تک جو سب کچھ تھا اس کی ذات ماوراء تھی۔ سمجھ سے ادراک سے پرے مگر یہ بے پروا گستاخ سوچ بھی تو اسی نے عطا

کی تھی۔ انسان سزاوار تھا کہ تخیل کی بلندیوں پر پہنچے اور اس کی ذات کا اپنے اندر اور باہر مشاہدہ کرے اس کو پائے تو اپنے آپ کو پائے۔ اسے پا یا ڈھونڈا اور اپنے مغالطوں میں شریک کیا جا سکتا تھا۔ روحیں اس نے پیدا کیں اور اس کا حصہ تھیں خدا کا حصہ مگر ہر آنکھ اس مشاہدے کے لئے نہیں بنائی گئی تھی۔

یہ اسے پا لینے دیکھ لینے اس سے ایک ہو جانے کے خواب۔ رویا جن میں بلاوا تھا لفظ نہیں۔ اس بلاوے میں صرف کشش ہوتی ہے اشارہ نہیں۔ ان اشاروں میں نہ کچھ کھلتا ہے اور نہ ہی پوشیدہ ہوتا ہے۔ روح نہ سوتی ہے نہ جاگتی ہے۔ جانے وہ کون ہوتا ہے کیوں بلاتا ہے؟

وہ سحر زدگی کی کیفیت اور وہ محسوس قوت جو آنکھوں کو دکھائی نہیں دیتی۔ بھلا آنکھوں کو کیوں اتنی کم روشنی عطا کی گئی ہے؟ روح میں لپٹا ہوا یوم الست سے رب۔ بارگاہ سے اندر بھی اور باہر بھی عدم بھی اور وجود بھی وہ آپ ہی تخت ہے اور جاپ پر بیٹھنے والا بھی۔ وہ ان دیکھا جو سکون بھی ہے اور دلوں کی تڑپ شبوں کا گداز بھی۔ اس کی چاپ ہمیشہ اسے اپنے آگے سنائی دیتی رہی ہے اور جان اپنی ساری درد سامانیوں کے ساتھ اسے پا لینے چھونے اور اس کے روبرو ہونے کی منتظر

ہمہ بند بند مرا چو نے۔ بو داز غم تو حکایتے۔

سردار کل عزیز خاں نے حبشی کو زدوکوب کیا کیا تم ایک عورت کا گلا گھونٹنے پر بھی قادر نہیں ہو؟

وہ پٹے ہوئے کتے کی طرح ہانپ رہا تھا۔

سردار نے زور سے تھوکا۔ دو بھلا کبھی یہ بھی سنا ہے کہ ایک حبشی جسے کسی شے پر یقین نہ ہو جو موت کی پرواہ نہ کرتا ہو۔ جو زندگی سے بے پرواہ ہو جو قاتل بھی ہو وہ ایک عورت کا گلا دبانے سے انکار کر دے اس میں طاقت ہی کتنی لگتی ہے۔

وہ پھر حبشی کے قریب آیا اسے بالوں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا اور کہا تم ایلم کے زندان کا مزہ چکھ چکے ہو۔

نہیں نہیں وہ کانپتے ہوئے اٹھا۔ مجھے سانس تو لینے دو میں تھک گیا ہوں تم لوگوں نے مجھے کیسی شراب پلائی ہے جو بزدل بنا دیتی ہے اس میں قبر کی مٹی کی بو ہے۔ سیال آگ سی ارغوانی شراب دو۔

بہانے مت بناؤ جاؤ اٹھو محافظوں نے اسے دھکیلا۔

حبشی آکر سردار کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ "ایلم کے بندی خانے نے مجھ سے وہ کام کروا لیا جو میں کسی قیمت پر نہ کرتا۔ سجدا قطعاً نہ کرتا۔ تم پر لعنت ہو تم نے ہمیشہ کے لئے میری روح کو شرمندہ کرنے کا سامان پیدا کر دیا ہے۔

" سردار نے زور سے اس کے منہ پر ایک ٹھوکر ماری اور اس تنگ کمرے کی طرف دوڑا کیا آخر آ گیا ہے"

نقاب منہ پر کسا ہوا تھا اور تانت اندر تک اتر گئی تھی۔ سفید لباس میں لپٹا بدن کپکپاتا تھا اور ساکت ہو جاتا تھا۔ سردار نے اسے ٹھوکریں ماریں اس سینے پر جس میں قدرت کے رازوں کے بند دروازے کھلتے تھے۔

بے چین پرند درختوں پر جاگ اٹھے اور زور زور سے بولنے لگے۔ ہوا یکا یک ماتم کرنے والوں کی طرح اٹھی اور گریہ کناں تناور درختوں میں شاخوں کی بانہیں ہلا کر سینہ کوبی کرتی رہی۔ رات ایک دم سیاہ ہو گئی۔ ستارے چھپ گئے اور غبار میں ڈھک گئے۔ گھوڑے ہنہنائے۔ بند تڑا کر بھاگ نکلے جیسے قیامت پلٹ پڑی ہو۔ سردار گل عزیز خاں نے اس جسم کو گھسیٹ کر اندھے کنوئیں میں دھکا دیا۔ غلاموں نے کاہنہ کے وجود کو سنگسار کرنے کے لئے کنوئیں کو مٹی پتھر اور خشک پتوں سے ڈھانپ دیا۔ پھر آسمان پر بجلیاں تڑپیں اور تیز بارش ہوئی کیا یہ خون ناحق تھا؛ آخر عناصر کیوں پریشان تھے؟

کبھی کبھی آسمان اپنی دوری کے باوجود زمین کے معاملے میں دخیل ہوتا ہے پھر پانی دھواں دھواں طوفان نوح کی طرح لحظہ بہ لحظہ چڑھتا گیا گویا دنیا کو ڈبو دے گا۔

اس عورت کو برہنگی سے سخت خوف آتا تھا۔

ہاں۔

ان کھنڈروں کے پاس رکو اور اس ویرانے میں ہمارے پیاروں کا ماتم کرو۔ اپنے خوبصورت ترین نوحے ان کی آرامگاہوں پر پڑھو انہیں پکارو اور ان کی تنہائی پر آنسو بہاؤ۔

مقدر کو ہم روک نہ سکتے تھے - ایلخانی باغ کے ان کھنڈروں کا کیا گلا اس لئے تم ہمارے پیاروں کی آرام گاہوں پر رکو اپنے عمدہ نوحے ان پر پڑھو ان کو پکارو اور ان کی تنہائی پر آنسو بہاؤ -

ہاں اے آرام جان دنیا تمھارے لئے دیدہ و دل فرش راہ کرتی تھی مگر دنیا کی محبت کا کیا اعتبار؟

اس کا کیا اعتبار جو کسی کو کچھ دے نہیں سکتی کسی کو دیکھ نہیں سکتی -

نیلے آسمان کا بھی کیا اعتبار جو دھلی آنکھوں سے بنا مروت کے تمھیں اپنی ہنسی کا نشانہ بنانے کے لئے تاکتا ہے -

زمستان کی راتوں میں چاندنی -

ہوا اور خوشبو - نغمہ اور ساز سب بیکار ہوتے ہیں -

کیونکہ کچھ آنکھیں جو واقف راز ہیں بند ہو چکی ہوتی ہیں -

تنہا تنہا میری جان ان بچھڑے ہوؤں پر نوحے پڑھو

انہیں پکارو اور ان کی تنہائی پر آنسو بہاؤ

٭ ٭ ٭ ٭

تمت بالخیر

گر بتو افتدم نظر چهره به چهره رو به رو
شرح دهم غم ترا نکته به نکته مو به مو

از پی دیدن رخت همچو صبا فتاده ام
خانه بخانه در بدر کوچه به کوچه کو به کو

میرود از فراق تو خون دل از دو دیده ام
دجله به دجله یم به یم چشمه به چشمه جو به جو

دور دهان تنگ تو عارض عنبرین خطت
غنچه به غنچه گل به گل لاله به لاله بو به بو

ابرو و چشم و خال تو صید نموده مرغ دل
طبع به طبع و دل به دل مهر به مهر و خو به خو

مهر ترا دل حزین بافته بر قماش جان
رشته به رشته نخ به نخ تار به تار و پو به پو

در دل خویش طاهره گشت و ندید جز ترا
صفحه به صفحه لا به لا پرده به پرده تو به تو